معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ سو روپے — فی شمارہ دس روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY , AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۶۹ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۲ء عدد ۳

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

شذرات

ملک میں رہ رہ کر بھیانک جنگل راج قائم ہوجاتا ہے اور امن ، انصاف اور قانون کی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا ہے، تشدد اور فرقہ وارانہ جنون کی لہر اتنے زور شور سے اٹھتی ہے کہ امن وسکون، شرافت وانسانیت اور اخوت ومحبت کو خس وخاشاک کی طرح اڑا لے جاتی ہے، حکومت کی مشنری معطل ہوجاتی ہے اور وہ شر وفساد کو روکنے، امن وامان قائم کرنے اور مظلوموں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد وحمایت سے جو اس کا فرض ہے ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور شر وفساد برپا کرنے والوں کی ساتھی بن جاتی ہے، ہندوستان جب آزاد ہوا تھا تو ملک میں جنگل کا یہی قانون رائج تھا، نفرت واشتعال کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، لوٹ مار، وحشت ودرندگی اور قتل وخوں ریزی حد انتہا کو پہنچ گئی تھی، ہندوستان کے محسن اعظم گاندھی جی دنیا بھر میں سچائی اور امن کے دیوتا کی حیثیت سے مشہور تھے، وہ جب اپنے ہم وطنوں کو ہنسا سے روکنے، اخوت اور ہندو مسلم اتحاد کا درس دینے کے لئے سامنے آئے تو کسی نے بات پوچھنا تو درکنار خود ان ہی کی ہتیا کردی، اس وقت کہا جاتا تھا کہ یہ تقسیم کا ردعمل ہے۔ جلد ہی وحشت و بربریت کا دور ختم ہوجائے گا، وقت گذرنے کے ساتھ سارے زخم بھر جائیں گے اور سب لوگ ماں جائے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے۔

وقت گذرتے دیر نہیں ہوتی، ملک کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرا مگر اسے جنگل راج سے چھٹکارا نہیں ملا، زخم پر زخم لگتے رہتے ہیں، ایک زخم بھرتا نہیں کہ اس سے کاری دوسرا زخم لگ جاتا ہے، ہر صبح ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ بن کر طلوع ہوتی ہے اور ہر روز شورشِ محشر لئے ہوئے ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ لوگ پرانے زخموں کو بھول جاتے ہیں اور نئی مصیبت ہی پر واویلا کرتے ہیں، ایک حماسی شاعر کہتا ہے۔

على انها تعفوا لكلوم وانما نوكل بالادنى وان جل ما مضى

اب تک آزادی کے بعد سے کتنے لرزہ خیز واقعات رونما ہوئے، گو عوام کا حافظہ کمزور ہو ہے اور رنج کا خوگر ہونے کے بعد رنج مٹ جاتا ہے، بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک نے کتنے روز سیاہ دیکھے، کان پور اور اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات تو ابھی بالکل تازہ ہیں مگر ذہنوں سے محو ہوچکے ہیں، ہاں بمبئی کی سفاکی وخوں ریزی اور شیوسینا کی وحشت ودرندگی ایسی سخت تھی کہ بھلائے

نہیں بھولتی، ابھی لوگ اسے بھولے بھی نہیں تھے کہ گجرات کے خوں چکاں واقعات سے پورے ملک میں زلزلہ آگیا ہے، گاندھی جی کی یہ سرزمین پہلے بھی مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہوتی رہی ہے اور خدا جانے کب مسلمانوں کے خون سے اس کی تشنگی بجھے گی، سال بھر پہلے وہاں ہولناک زلزلہ آیا تھا جس کے جھٹکے ساری دنیا نے محسوس کئے اور اپنے کلیجے نکال کر رکھ دیئے اور اب جو بھونچال آیا ہے، تو سارا ملک شرم سار ہے اور ساری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہورہی ہے۔

یہ ظلم وتشدد اور گجرات میں کئی روز تک ہونے والی آتش زنی اس لئے ہوئی کہ سابرمتی اکسپریس کی بعض بوگیوں میں شرپسندوں نے آگ لگادی تھی جس سے ایک بوگی اور ۵۷ افراد جل کر خاکستر ہوگئے تھے اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہوگئے تھے، یہ گھناؤنا، بے رحمانہ اور وحشیانہ واقعہ سخت قابلِ مذمت ہے جو لوگ بھی اس کے مرتکب ہیں، انہیں قرار واقعی سزا ملنی چاہئے لیکن مجرموں کو عبرت ناک سزا دینا حکومت کا کام ہے جو لوگوں کے جان ومال کی محافظ اور امن وامان قائم کرنے کی اصل ذمہ دار ہے مگر اس کو شرپسندوں اور فساد وبلوہ کا موقع ڈھونڈنے والوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تقریباً ایک ہفتے تک آگ وخون کی ہولی کھیلنے اور بے قصور شہریوں کی جان، مال، اسباب اور جائداد لوٹتے اور تباہ کرتے رہے، حکومت نے ان سے مزاحمت کرنے کے بجائے کرفیو لگا کر ان کا کام آسان کردیا، وہ ہر جگہ دندناتے پھر کر پولیس کی سرپرستی میں آتش زنی اور قتل وغارت گری کرتے اور اقلیتوں کے محلوں کو مرگھٹ بناتے رہے، کرفیو صرف اقلیتوں کے لئے تھا کہ وہ اپنا کوئی بچاؤ نہ کرسکیں اور گھروں میں محصور ہوکر لٹیروں اور بلوائیوں کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کردیں اور گھر سے باہر ہونے پر یہ ہتھیار بند لوگ انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنادیں، بہار کے سوشلسٹ اور سیکولر وزیروں کو صرف بہار ہی کا جنگل راج دکھائی دیتا ہے اور بی جے پی کی مرکزی حکومت جمہوریت کا خون کرکے بہار اور اترپردیش میں صدر راج قائم کرسکتی ہے لیکن گجرات کی نااہل اور نکمی حکومت کو برخواست نہیں کرسکتی ہے، وہ سیمی جیسی بے ضرر تنظیم پر پابندی لگاسکتی ہے، مگر وشو ہندو پریشد جیسی شرپسند اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والی ضرر رساں تنظیم پر کوئی قدغن نہیں لگاسکتی، کیا یہ دہرا معیار نہیں ہے۔

گودھرا میں ٹرین کی بوگیاں جلانے والوں کا پتہ اتنی جلدی کیسے چل گیا کہ یہ مسلمان تھے اس لئے احمد آباد اور دوسرے شہروں میں اس کا ردعمل شروع ہوگیا، کیا اس لئے کہ جلائے جانے والے

کارسیوک تھے یا اس لئے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جہاں ٹرین رکی تھی وہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، کیا ایسے ہی مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر پوری ریاست کو آگ میں جھونک دینا اور مسلمانوں کو کچل ڈالنا کسی ذمہ دار حکومت کے لئے مناسب تھا، قیاس تو یہ کہتا ہے کہ بوگی میں جلنے والے کارسیوک نہیں تھے، کیوں کہ ان میں عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد بہت کم تھی، کارسیوک تو پوری گاڑی میں تھے اگر ان ہی کو جلانا ہوتا تو ایک ہی بوگی کیوں جلائی جاتی اور اگر واقعتاً ان ہی کو جلانے کے لئے یہ حرکت کی گئی تھی تو وہ جس طرح کے لوگ تھے اس کا اندازہ ان کے سیٹوں اور برتھوں پر زبردستی قبضہ کر لینے اور کھانے پینے کی چیزیں بلا قیمت لے لینے سے ہوتا ہے، بھلا ایسے دھینگا مشتی کرنے والے ٹرین میں روکے جانے کے بعد اس بوگی سے بھاگ نہیں گئے ہوں گے اور ساری بلا بے چارے کمزوروں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے سر گئی مگر یہ ساری باتیں اٹکل پچو ہے، بعد میں ہونے والے واقعات کی ساری ذمہ داری گجرات کی حکومت پر ہے، جس کے سربراہ نے فساد کے جواز کے لئے رد عمل کا راستہ ڈھونڈ نکالا اور اپنی نااہلی کو چھپانے کے لئے یہ تاثر دے کر فضا کو اور مسموم کر دیا کہ جلانے والے مسلمان اور جلنے والے کارسیوک تھے، اگر یہ صحیح بھی ہو تو ایک ہفتہ تک ان کی حکومت مفلوج اور ساری باگ ڈور عملاً فسادیوں اور بلوائیوں کے ہاتھ میں کیوں چلی گئی تھی۔

اصل واقعات وحقایق تو تفتیش کے بعد ہی سامنے آئیں گے جس کی امید نہیں لیکن اگر آ بھی جائیں تو اس جنگل راج میں کیا ہوگا، بمبئی، ملیانہ اور ہاشم پورہ کے مجرموں کا کیا بگڑا؟ سنگھ پریوار کے لوگ جس قسم کا ماحول بنانے میں ایک مدت سے لگے ہوئے ہیں اس میں ملک ترقی نہیں کر سکتا، اسی طرح کے فسادات ہوتے رہیں گے، ملک کے باشندوں میں کشیدگی اور دوری بڑھا کر زمین کو اتنا سنگلاخ بنا دیا گیا ہے کہ اب میل ملاپ، الفت ومحبت اور ہمدردی واخوت کے پودے کا برگ وبار لانا ممکن نہیں، اقلیت دشمنی اس کی گھٹی میں داخل ہے، مسلمانوں کو خائف، ہراساں اور دہشت زدہ کرنا اور زبردستی اپنے عقائد وخیالات ان پر مسلط کرنا اور ان کی تہذیب وثقافت کو مٹانا ان کا شیوہ ہے، گو ملک میں ابھی بڑا طبقہ مشترکہ گنگا جمنی تہذیب سے جڑا ہوا ہے لیکن بی جے پی کے برسراقتدار آنے سے فسطائیت پسندوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں مگر اسے سمجھنا چاہئے کہ یہ سستے، سطحی اور اوچھے طریقے بہت دنوں تک نہیں چل سکتے، ان سے صرف اس کو عارضی فائدے ہوں گے، حکومتیں حق وعدل، مخلوق کی خدمت اور نفع رسانی سے باقی رہتی ہیں اور ظلم، تشدد، بدعنوانی، ناانصافی اور کرپشن سے ختم ہو جاتی ہیں۔

فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا سالِ وفات

از جناب فیروز الدین احمد فریدی ★

(۳)

(iii) صفحہ نمبر ۱۸۱ اور ۱۸۲ کے فٹ نوٹ میں تحریر ہے:

سالِ وفات کے متعلق مختلف تذکرے مختلف البیان ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

تذکرہ	سالِ وفات
(۱) سیر الاقطاب۔	۶۹۰ھ
(۲) راحت القلوب۔	۶۸۷ھ
(۳) خزینۃ الاصفیاء۔	۶۷۰ھ
(۴) جواہر فریدی	۶۶۴ھ
(۵) سیر الاولیاء	۶۶۴ھ
(۶) اخبار الاخیار	۶۶۴ھ
(۷) سفینۃ الاولیاء	۶۶۴ھ
(۸) فرشتہ	۶۶۰ھ

سب سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ بلبن نے ۶۸۵ھ (مطابق ۱۲۸۶ء) میں وفات پائی، چنانچہ ۶۹۰ھ اور ۶۸۷ھ باباصاحب کے سالہائے وفات نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ "خزینۃ الاصفیاء" کے اس اردو ترجمے میں جو ہمارے سامنے ہے، باباصاحب کا سالِ وفات ۶۷۰ھ درج نہیں ہے۔ اس اردو ترجمے کے ضروری کوائف یہ ہیں:۔

(۴) "خزینۃ الاصفیاء" مصنف: مفتی غلام سرور لاہوری مترجم: اقبال احمد فاروقی ناشر: مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور

★ کنٹرول ہاؤس۔ ۵۴۔ اے اسٹریٹ نمبر ۱۵ گلشن فیصل۔ باتھ آئی لینڈ۔ کراچی

سال تالیف: ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) سالِ طباعت: فارسی ایڈیشن: ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) اردو ترجمہ: ۱۹۹۰ء صفحہ نمبر ۱۳۶ پر تحریر ہے:

''حضرت خواجہ فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ''اخبار الاخیار'' اور ''سفینۃ الاولیاء'' میں پانچ محرم بروز منگل ۶۶۴ھ لکھی ہے مگر تواریخ فرشتہ میں ۶۶۶ھ، مخبر الواصلین اور تذکرہ العاشقین کے علاوہ شجرۂ چشتیہ میں معتبر اقوال کے ساتھ ۶۶۷ھ لکھا ہے۔ سیر الاقطاب کے مصنف نے ۶۹۰ھ لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی بات قابلِ تسلیم ہے۔''

گویا ''خزینۃ الاصفیاء'' کے مطابق بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۷۰ھ نہیں بلکہ ۶۹۰ھ ہے جسے تاریخ تسلیم نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وحید احمد مسعود فریدی صاحب نے، فرشتہ کے حوالہ سے، بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۰ھ لکھا ہے جب کہ خزینۃ لاصفیاء بتارہی ہے کہ تاریخ فرشتہ میں یہ سال ۶۶۶ھ لکھا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر ۱۵۔ ۱۹۷۵ء) کے صفحہ نمبر ۳۳۹ کے مطابق، تاریخ فرشتہ میں، غالباً کتابت کی غلطی سے ۶۷۰ھ کی بجائے ۷۶۰ھ لکھا گیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ وحید احمد مسعود فریدی صاحب مرحوم اور پنجاب یونیورسٹی کی مندرجہ بالا عالمانہ تصنیف یعنی اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر ۱۵) دونوں تاریخ فرشتہ کا حوالہ دے رہے ہیں، تاہم ایک کے مطابق فرشتہ نے سالِ وفات ۶۶۰ھ لکھا ہے اور دوسرے کے مطابق ۷۶۰ھ لکھا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے مطابق ۷۶۰ھ غالباً کتابت کی غلطی ہے اور ۷۶۰ کو ۶۷۰ ہونا چاہئے تھا۔ ہمارا ابتدائی تبصرہ یہ ہے کہ اگر ۷۶۰ کتابت کی غلطی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ۷۶۰ کو ۶۷۰ ہونا چاہئے تھا۔ کتابت کی غلطی درست کرنے کا یہ طرزِ استدلال سہل اور دلچسپ تو ضرور ہے لیکن اسے درست قرار دینا خاصا مشکل نظر آتا ہے۔ اس پر مزید تبصرہ آگے کیا گیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۸ پر یہ بھی لکھ دیا کہ انھوں نے خواجہ نظام الدین اولیاء کی ''تقویت'' پر بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۱ھ لکھا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مستند ملفوظات ''فوائد الفواد'' ہیں جن میں کہیں بھی بابا صاحب کے سالِ وفات کا ذکر نہیں، ۶۶۱ھ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وحید احمد مسعود فریدی مرحوم نے ہمیں اپنی مبینہ تقویت کے منبع کی تفصیلات سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا چنانچہ مزید تبصرے کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔

(۵) اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ (جلد نمبر: ۱۵) پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۷۵ء) صفحہ نمبر: ۳۳۹

''۔۔۔اختلاف سنہ وفات میں بھی پایا جاتا ہے۔ (امیر خورد) کرمانی نے یہ تاریخ پانچ محرم ۶۶۴ھ/ سترہ اکتوبر ۱۲۶۵ء (دوشنبہ) دی ہے اور تاریخ فرشتہ (بمبئی، ۲: ۳۹۷) نے پانچ محرم ۶۷۰ھ/ تیرہ اگست ۱۲۷۱ء (پنج شنبہ) لکھی ہے۔ دیگر قرائن سے مؤخر الذکر تاریخ وفات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ تاریخ فرشتہ میں غالباً کتابت کی غلطی سے ۶۷۰ھ کی بجائے ۷۶۰ھ لکھا گیا ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس پر، ہمارا پہلا تبصرہ یہ ہے کہ امیر خورد کرمانی کی ''سیر الاولیاء'' (کے جن نسخوں) میں جہاں بابا صاحب کا سالِ وفات ۶۶۴ھ لکھا گیا ہے، وہاں یومِ وفات دوشنبہ (پیر) نہیں بلکہ سہ شنبہ (منگل) درج ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ پاکستان کی اس قدیم اور عظیم یونیورسٹی کی ۲۷ جلدوں پر مشتمل اس ۳۴ سالہ (۱۹۶۴ء تا ۱۹۹۷ء) علمی کاوش میں ''پیر'' کا روز ''سیر الاولیاء'' کے کس قدیم قلمی نسخے سے اَخذ کیا گیا ہے۔ اگر یہ نسخہ موجود ہے تو انتہائی نایاب مخطوطہ ہوگا۔

ہمارے دوسرے تبصرے کا تعلق مندرجہ بالا اقتباس کی آخری سطر سے ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ''تاریخ فرشتہ میں غالباً کتابت کی غلطی سے ۶۷۰ھ کی بجائے ۷۶۰ھ لکھا گیا ہے۔'' اس پر ایک جُزوی اور ابتدائی تبصرہ تو گزشتہ سطور میں کیا جاچکا ہے، مزید اور مکمل تبصرے کے لیے سب سے مناسب یہ لگتا ہے کہ تاریخ فرشتہ سے متعلق اقتباس، بلا تبصرہ، قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

(۶) ''تاریخ فرشتہ'' مصنف: محمد قاسم ہندوشاہ ناشر: منشی نول کشور، لکھنؤ۔ بھارت سالِ اشاعت: ۱۸۶۴ء

جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۹۰ پر فارسی متن اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

''آنگاہ سر بسجدہ گزاشت و در میانِ سجدہ رحلت کرد، وایں واقعہ شبِ پنج شنبہ، پنجم ماہِ محرم، سنہ ستین وسبعمایۃ (۷۶۰) رُونمود۔''

ترجمہ: اس وقت (بابا صاحب نے) سر سجدے میں رکھا اور سجدے کے دوران رحلت فرماگئے۔ یہ واقعہ جمعرات کی شب، پانچ محرم، سات سو ساٹھ (ہجری) ۷۶۰ (ہجری) میں ہوا۔

اگر مندرجہ بالا اقتباس میں، ۷۶۰ کا عدد صرف ہندسوں میں لکھا ہوتا تو کاتب کی غلطی سے ۶۷۰ کو ۷۶۰ لکھنا خارج از امکان نہ تھا لیکن یہاں تو ''۷۶۰'' پہلے الفاظ میں لکھا گیا تا کہ ہندسوں کے اُلٹ

پھیر کی غلطی سے بچا جائے اور پھر تائید مکرر کے لیے "۶۷۰" ہندسوں میں بھی لکھا گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۶۷۰ھ بابا صاحب کا سالِ وفات نہیں ہوسکتا۔ بلبن نے ۶۸۵ھ (مطابق ۱۲۸۶ء) میں وفات پائی۔ بابا صاحب اس سے کہیں پہلے رحلت کر گئے تھے۔" تاریخ فرشتہ کی یہ ایک بدیہی غلطی ہے لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسی صفحے (۳۹۰) پر، چند سطور کے بعد، "تاریخ فرشتہ" جو کچھ بتاتی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بابا صاحب ۶۶۹ھ میں مرض الموت میں مبتلا ہوئے، اس کے بعد اکیانوے (۹۱) برس زندہ رہے اور تقریباً ۹۳ برس کی عمر میں ۶۷۰ھ میں انتقال کر گئے۔ صفحہ نمبر ۳۹۰ سے ہی دوسرے اقتباس کا فارسی متن یہ ہے:

"از شیخ نظام الدین اولیا منقول ہست کہ شیخ رارنجوری خلہ واقع شد کہ آخر بہمان زحمت برحمتِ حق پیوست و دراں رنجوری مرا بکسوتِ خاص نواختہ، در ماہِ شوال سنہ تسع وستین وستمائہ (۶۶۹) بجانب دہلی رواں ساخت ودروقتِ وداع آب دردیدہ گردانیدہ گفت برو ترا بخدائے تعالیٰ سپردم۔"

ترجمہ: شیخ نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ شیخ (بابا صاحب) کو خلہ کا مرض لاحق ہوگیا تھا اور اسی مرض میں آپ کا انتقال ہوا۔ اس بیماری میں، مجھے خلعتِ خاص سے نوازا اور شوال چھے سو انہتر (۶۶۹) کو دہلی رخصت کرتے وقت پُرنم آنکھوں سے کہا: جاؤ میں نے تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔

(۷) "آکھیا بابا فرید نے" مصنف: محمد آصف خاں ناشر: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور
سال اشاعت: پہلا ایڈیشن: ۱۹۷۸ء دوسرا ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

یہ کتاب پنجابی زبان میں ہے، جس کے دوسرے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۲۵ سے ایک اقتباس کا رواں اردو ترجمہ یہ ہے:

"فرشتہ کے علاوہ، بیشتر مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ بابا فرید "منگل، ۵ محرم" کو وفات پاگئے، اب اگر ہم اس کا تعین کرسکیں کہ وہ کون سا برس تھا جس میں یہ دن اور تاریخ ایک ساتھ آئے تو بات خود بخود واضح ہوجائے گی۔۔۔ ۶۷۹ھ میں، ۵ محرم اور منگل ایک ساتھ تھے ۔۔۔ یہ وہ تاریخ ہے جب بابا فرید اپنے رب سے جا ملے۔ انگریزی تقویم کے مطابق یہ ۷ مئی ۱۲۸۰ء، منگل تھا۔"

بابا صاحب کے سالِ وفات کے تعین کے لیے، پروفیسر آصف خان نے جو راہِ عمل اختیار کی، وہ سہل تو ضرور تھی لیکن سیدھی اور صحیح نہیں تھی۔ وہ دو بدیہی غلطیوں کا شکار ہوکر، غلط نتیجے پر پہنچے۔

پہلی بدیہی غلطی تو یہ ہے، کہ ۶۷۹ھ (مطابق ۱۲۸۰ء) سے پورے آٹھ برس پہلے، یعنی ۶۷۱ھ (مطابق ۱۲۷۲ء) میں بھی ۵ محرم اور منگل ایک ساتھ آئے تھے۔ پروفیسر آصف خاں نے اپنی محققانہ کتاب میں اس کی کہیں تشریح نہیں کی کہ وہ ۶۷۱ھ چھوڑ کر، ۶۷۹ھ پر کیوں پہنچ گئے۔

دوسری بدیہی غلطی یہ ہے کہ بابا صاحب نے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے ابتدائی دور میں وفات پائی۔ بلبن کا دورِ سلطانی ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء (۶۶۴ھ سے ۶۸۵ھ) پر محیط ہے۔ اگر پروفیسر آصف خاں (۵ محرم) ۶۷۱ھ (مطابق ۱۲۷۲ء) کو جو منگل کا دن بھی تھا، بابا صاحب کا سال وفات قرار دیتے تو ان کی بات اس حد تک قابل قبول ہوتی کہ ۶۷۱ھ کو بلبن کے عہد کا ابتدائی دور شاید کہا جاسکتا تھا لیکن ۶۷۹ھ (مطابق ۱۲۸۰ء)، بلبن کے عہد کا آخری دور کہلائے گا، ابتدائی دور نہیں۔

ان دو غلطیوں کے علاوہ، پروفیسر آصف خاں کے طرزِ استدلال و استخراج پر، ڈاکٹر منظور ممتاز نے اپنی کتاب "پیامِ گنج شکرؒ" میں جو وزنی اعتراضات کیے ہیں، وہ ڈاکٹر منظور ممتاز کے اپنے الفاظ میں نیچے درج کیے جارہے ہیں:

(۸) "پیامِ گنج شکرؒ" مصنف: ڈاکٹر منظور ممتاز ناشر: نذیر سنز، ۴۰۔اے، اردو بازار، لاہور
سال اشاعت: ۱۹۹۹ء۔ صفحہ نمبر: ۶۳

"پروفیسر آصف خاں نے اپنی پنجابی کتاب "آکھیا بابا فرید نے" میں صرف منگل، ۵ محرم کو پیش نظر رکھا ہے اور اسی سے استدلال کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو باباجیؒ کے رمضان میں لاحق ہونے والے مرض الموت کو ذہن میں رکھا ہے اور نہ رمضان میں مئی جون کے موسم کو جو حضرت باباجیؒ کے علاقے میں خربوزے کی فصل کا موسم ہے اور نہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے سن (سنہ) انتقال کو کوئی اہمیت دی ہے اور نہ ہی شیر خان والیٔ اُچ و ملتان سے متعلق حضرت بابا جی کے فرمان کی کڑی اپنے طریقِ استدلال سے ملائی ہے۔ اس لیے ان کی تحقیق "فوائد الفواد" کے شواہد اور واقعات کی بنا پر درست نہیں رہی۔"

پروفیسر محمد آصف خاں کے طرزِ استدلال پر ان برمحل اعتراضات کے بعد، ڈاکٹر منظور ممتاز

نے (خصوصاً شیر خاں والیٔ ملتان کے بارے میں) جو پُر پیچ طریق استدلال اختیار کیا ہے، اس کی وجہ سے ڈاکٹر منظور ممتاز اس غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "حضرت باباجیؒ کا وصال منگل ۴ محرم ۶۶۵ھ کو آدھی رات کے لگ بھگ ہوا اور تدفین ۵ محرم ۶۶۵ھ بروز بدھ ہوئی جو ۱۶/اکتوبر (سولہ اکتوبر) ۱۲۶۶ء تھی۔"

واضح رہے کہ مندرجہ بالا غلط نتیجہ اخذ کرنے کے علاوہ، ڈاکٹر منظور ممتاز کی کتاب میں 'صفحہ نمبر ۶۳ پر' بابا صاحب کی تاریخِ وفات کا ۱۶/اکتوبر لکھے جانا کتابت کا سہو ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰ پر، دو جگہ، بابا صاحب کی تاریخِ وفات چھے اکتوبر ۱۲۶۶ء درج ہے جو نتیجے کے لحاظ سے غلط سہی، لیکن قمری تاریخ، ماہ و سال (۵ محرم ۶۶۵ھ) کی مطابقت کے اعتبار سے صحیح ہے۔

(۹) "مقام گنج شکر" مصنف: کپتان واحد بخش سیال ناشر: پہلا ایڈیشن: ۱۹۷۹ء، بختیار پرنٹرز، دربار مارکیٹ، گنج بخش روڈ، لاہور دوسرا ایڈیشن: ۱۹۹۸ء: بزم اتحاد المسلمین، لاہور

(۱) پہلے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۳۰، اور دوسرے ایڈیشن کے صفحات نمبر ۱۴۱ اور ۱۴۲ پر درج ہے:

"حضرت بابا فریدالدین مسعودؒ کا ---- سِن (سنہ) وفات سیر الاولیاء کے مطابق ۶۶۴ھ ہے لیکن ہمارے شجرۂ شریف میں حضرتِ اقدس کا سِن (سنہ) وفات ۶۶۸ھ ہے جو کشفی معلوم ہوتا ہے اور اصح (اصح) ہے۔"

(۲) پہلے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۳۲، اور دوسرے ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۱۴۳ پر درج ہے:۔

"تاریخِ وفات: پانچ محرم ۶۶۸ھ"

(۱۰) "فکرِ فرید" مصنف: سلیم یزدانی ناشر: ڈینز پبلی کیشنز، D/I/3 جیکب لائنز، کراچی
سالِ اشاعت: ۱۹۸۵ء۔ صفحہ نمبر: ۱۱۶

"حضرت بابا صاحب کی وفات ۵ محرم ۶۶۳ھ کو ہوئی۔ یہ واقعہ پنج شنبہ (جمعرات) کی رات کا ہے۔"

ہمارے تین تبصرے ہیں۔ اولاً سلیم یزدانی صاحب نے بابا صاحب کا ایک بالکل مختلف سالِ وفات تو لکھ دیا لیکن اس کا ماخذ نہیں بتایا۔ ثانیاً بلبن ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں سلطان بنا اور معتبر تاریخ کی شہادت ہے کہ بابا صاحب اس وقت زندہ تھے۔ اس لیے ۶۶۳ھ (۱۲۶۴ء) آپ کا

سالِ وفات نہیں ہو سکتا۔ ثالثاً ۵ محرم ۶۶۳ھ کو منگل تھا، جمعرات نہیں۔ جمعرات کی روایت صرف "تاریخِ فرشتہ" میں درج ہے لیکن اس میں بابا صاحب کا سنہ وفات، الفاظ اور اعداد دونوں میں، ۶۷۰ھ درج ہے جو بدیہی طور پر غلط ہے۔

(۱۱) "تذکرہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ" مصنف: طالب ہاشمی ناشر: شعاعِ ادب، مسلم مسجد لاہور
سالِ اشاعت: نہیں دیا، صفحہ نمبر: ۱۷۴

"حضرت بابا صاحب نے باختلافِ روایت ۹۰ سے ۱۰۷ برس کے درمیان عمر پائی۔ آپ کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں سخت اختلاف ہے۔ تاریخِ فرشتہ میں ۶۶۰ھ (پچھلے صفحات میں تبصرہ ہو چکا ہے کہ یہ سنہ تاریخِ فرشتہ میں درج نہیں ہے)، سیر الاولیاء، سفینۃ الاولیاء، اخبار الاخیار اور جواہرِ فریدی میں شب سہ شنبہ (منگل) ۵ محرم ۶۶۴ھ، سیر الاقطاب میں ۶۹۰ھ (پچھلے صفحات میں تبصرہ ہو چکا ہے کہ یہ سنہ درست نہیں ہو سکتا۔)، خزینۃ الاصفیاء اور سلسلۃ الاولیاء میں چہار شنبہ (بدھ) ۵ محرم الحرام ۶۷۰ھ اور آئینِ اکبری میں ۶۶۸ھ درج ہے۔ مولوی محمد صالح کنجاہی نے "سلسلۃ الاولیاء" میں مرزا مظہر جان جاناں کا ایک تاریخی قطعہ درج کیا ہے جس سے ۶۷۰ھ تاریخ نکلتی ہے۔"

پچھلے صفحات میں ہم "خزینۃ الاصفیاء" پر ایک مختصر تبصرہ کر چکے ہیں جس کا سالِ تالیف ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء ہے۔ ہمارا آخری تبصرہ یہ ہے کہ "خزینۃ الاصفیاء" میں بابا صاحب کے مختلف سنینِ وفات کے مختلف تاریخی قطعے جمع کیے گئے ہیں۔ کسی تاریخی قطعے سے بابا صاحب کا سنہ وفات ۶۶۴ھ نکلتا ہے، کسی کے مطابق ۶۶۶ھ، کسی کے مطابق ۶۷۰ھ اور خود "خزینۃ الاصفیاء" کے مؤلف کے مطابق ۶۹۰ھ ہے، جو درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ سنہ سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات (۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء) کے پانچ برس بعد ہے جب کہ بابا صاحب کا انتقال بلبن کے ابتدائی دورِ سلطانی میں ہوا۔

مزید تاریخی قطعے "آکھیا بابا فرید نے" نامی کتاب کے صفحات ۱۸۔۱۹ پر درج ہیں۔ کسی تاریخی قطعے کے مطابق بابا صاحب کا سنہ وفات ۶۶۳ھ، کسی کے مطابق ۶۷۰ھ اور کسی کے مطابق ۶۸۰ھ بنتا ہے۔ اس طرح ہم اس خاصی عجیب صورتِ حال سے دوچار ہیں کہ سات مختلف سال یعنی ۶۶۳ھ، ۶۶۴ھ، ۶۶۶ھ، ۶۷۰ھ، ۶۷۹ھ، ۶۸۰ھ اور ۶۹۰ھ، تاریخی قطعات کی بنا پر، بیک وقت،

بابا صاحب کے سنہ وفات ہونے کے دعوے دار بنے ہوئے ہیں۔

تاریخی قطعات کے ضمن میں، ایک کتاب کا ذکر ضروری ہے جو مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں مرتب ہوئی یعنی گیارہویں صدی ہجری/سترھویں صدی عیسوی کے دوران۔ یہاں پھر یاد دلاتے چلیں کہ یہ وہی صدی ہے جب دارا شکوہ، مولانا علی اصغر چشتی اور (غالبًا) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کا سنہ وفات لکھ رہے تھے اور ابوالفضل اور شیخ عبدالرحمٰن چشتی ۶۶۸ھ بتا رہے تھے۔ کتاب کا نام "مخزن الواصلین" ہے اور یہ نامور صوفیہ کی تاریخ ہائے وفات کے تاریخی قطعوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں بابا صاحب کے سنہ وفات کے بارے میں جو تاریخی قطعہ درج ہے، اس کے مطابق سال وفات ۶۷۰ھ نکلتا ہے۔ اس کتاب کی دوسری اور انتہائی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شیخ بہاء الدین زکریا کے سنہ وفات کے بارے میں جو تاریخی قطعہ درج ہے، اس کے مطابق ان کا سنہ وفات ۶۶۷ھ نکلتا ہے۔ ہماری نظر سے یہ پہلی کتاب گزری ہے جس میں شیخ بہاء الدین زکریا اور بابا صاحب کی وفات کے درمیان، تین برس کا وہی فرق بتایا گیا ہے جو "فوائد الفواد" کے انگریزی ترجمے "MORALS FOR THE HEART" اور "سیر الاولیاء" میں خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب ہے۔ کتاب کے کوائف یہ ہیں:

"مخزن الواصلین" مؤلف: ابوعبداللہ محمد فاضل بن سید حسن حسینی ترمذی اکبرآبادی عہد تالیف: عہد شاہ جہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) ناشر: کتب خانہ نذیریہ، مسلم منزل، کھاری باؤلی، دہلی سال اشاعت: نہیں دیا۔

صفحہ نمبر ۵۶: تاریخ رحلت: بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ

"لیک شد سال نقل او بہ یقیں شاہباز مقام علیین" ۶۶۷ھ

صفحہ نمبر ۵۷: تاریخ رحلت: شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہٗ

"فریدالدین ولی واصل حق" ۶۷۰ھ

یہ مصرع مرزا مظہر جانِ جاناں کے اس تاریخی قطعے کا حصہ ہے:

فریدالدین کہ او گنج شکر بود — چو در ذاتِ خدا شد محوِ مطلق

بمظہر گفت ہاتف سالِ نقلش — فریدالدین ولی واصلِ حق

(۱۲) "فرمایا خواجہ گنج شکرؒ نے" (زیر طبع) مصنف: ڈاکٹر اسلم فرخی

اردو کے نامور معلم، محقق، ادیب اور خواجہ نظام الدین اولیاء پر کئی کتابوں کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی نے مندرجہ بالا زیرِ طبع کتابچے کے مسودے میں لکھا ہے:

"(بابا صاحب کے) سالِ وفات میں اختلاف ہے۔ ۶۶۴ھ یا ۶۷۰ھ۔ امیر خورد (کرمانی) نے "سیر الاولیاء" میں لکھا ہے کہ شیخ نے حضرت محبوب الٰہی کو خلافت نامہ بدھ، تیرہ رمضان ۶۶۹ھ کو عطا فرمایا تھا۔ اس بیان کی رُو سے ۶۷۰ھ صحیح سالِ وفات قرار پاتا ہے۔"

اُن حقائق اور تبصروں کی روشنی میں جو پچھلے صفحات میں ہیں۔ ۶۶۴ھ کے بارے میں اب اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ ۶۶۴ھ میں بابا صاحب زندہ تھے اور تاریخ فیروز شاہی کے الفاظ میں، "اس خطۂ زمین کے لوگوں کو انہوں نے اپنی پناہ اور اپنے سائے میں لے رکھا تھا ان کے قُرب اور برکتِ انفاس سے لوگ دین و دنیا کی مصیبتوں سے نجات پاتے تھے اور جو اس کے اہل تھے، وہ ان کی ارادت کے ذریعے بلند مراتب حاصل کرتے تھے۔"

حصہ چہارم اس میں چوتھے سال پر بحث و تبصرہ کر کے دکھایا جائے گا کہ صحیح سنہ وفات کیا ہو سکتا ہے اور اس کی تائید میں کیا اسناد و شواہد ہیں؟

اَب ہم اس (خشک) مضمون کے دلچسپ حصے پر آتے ہیں۔ بابا صاحب کی جائے ولادت کے تعین کی طرح، بابا صاحب کے سنہ وفات کے تعین کے لیے، رہنمائی خواجہ نظام الدین اولیاء سے ہی ملے گی۔ "فوائد الفواد" میں، اس بارے میں، تین اہم اشارے دیئے ہیں۔ پہلے یہ اشارے درج کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر تبصرے۔

پہلا اشارہ: منگولوں کا ملتان پہنچ جانا

یہ اشارہ "فوائد الفواد" کی پانچویں جلد کی دوسری مجلس میں ہے جو نو (۹) رمضان ۷۱۹ھ (مطابق ۲۴/اکتوبر ۱۳۱۹ء) جمعرات کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ فارسی ایڈیشن سے متعلقہ اقتباس اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ یہ ہے:

(۱) "فوائد الفواد" ناشر: شیخ سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور

سال اشاعت: ۱۹۶۶ء صفحہ نمبر: ۳۷۴

"چوں شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز از دنیا برفت، ہماں سال کافران دراں دیار رسیدہ۔"

(۲) ''فوائد الفواد'' مترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی سال اشاعت: نہیں دیا صفحہ نمبر: ۹۹ء

''جب شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہٗ العزیز دنیا سے تشریف لے گئے، تو اسی سال کافر (منگول) علاقے پہنچ گئے۔''

(۳) ''فوائد الفواد'' مترجم: محمد سرور ناشر: علماء اکیڈیمی، محکمۂ اوقاف، حضوری باغ، لاہور
سال اشاعت: ۱۹۸۰ء صفحہ نمبر: ۲۷۱

''جب شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہٗ العزیز دنیا سے رحلت فرماگئے تو اسی سال کافروں (تاتاریوں) نے اس علاقے پر یلغار کی۔''

"MORALS FOR THE HEART" Translater= Bruce B. Lawrence

Publisher= paulist press, 997 Macarthur Boulevard, Mahwah, new Jersey-07430

U.S.A year of publication= 1992 page: 327

When Shaykh Farid ad-din died, the Same year, the infidels (,i-e, the Mongols) invaded the region (uchch and Multan)

دوسرا اشارہ: باباصاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا کی وفات کے درمیان تین برس کا وقفہ

یہ اشارہ ''فوائد الفواد'' کی چوتھی جلد کی گیارہویں مجلس میں ہے جو انتیس (۲۹) ذی الحجہ ۷۱۴ھ (مطابق پانچ اپریل ۱۳۱۵ء) ہفتے کے دن دہلی میں منعقد ہوئی۔ ''فوائد الفواد'' کے فارسی (لاہور-۱۹۶۶ء) ایڈیشن اور دونوں اردو تراجم میں تحریر ہے کہ ''پہلے شیخ سعدالدین حمویہ کا انتقال ہوا، اور اس کے تین برس بعد شیخ فریدالدین کا''، [''فوائد الفواد'' کے انگریزی ترجمے کے صفحہ نمبر ۳۸۰ پر، نوٹ نمبر ۷۰ کے مطابق، شیخ سعدالدین حمویہ کا انتقال ۶۴۹ھ یا ۶۵۰ھ (مطابق ۱۲۵۱ء یا ۱۲۵۲ء) میں ہوا۔] ''فوائد الفواد'' کے انگریزی ترجمے کا متن ''فوائد الفواد'' کے مندرجہ بالا فارسی اور اردو متن سے مختلف ہے، اور ''سیرالاولیاء'' میں درج اس فرمودے سے مطابقت رکھتا ہے جو خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب ہے۔ انگریزی ترجمے کا متن، جو کتاب کے صفحہ نمبر ۲۳۰ پر ہے، یہ ہے،

'Then the Master- may God remember him with favour- noted Shaykh Sa'd ad- din Hamuya died, then three years later

Shaykl sayf ad-din Bakharzi died, and three years ofter himBaha ad-din Zakariya, and finally three years later Shaykh Farid ad-din [also died.]."

مضمون کے پہلے حصہ میں، قومی عجائب خانہ کراچی کے ''سیرالاولیاء'' کے قلمی نسخے (مفروضہ صفحہ نمبر ۱۱۳) اور لاہور سے چھپنے والے ''سیرالاولیاء'' (فارسی-۱۹۷۸ء اور اردو ترجمہ-۱۹۸۰ء) کے جن دو ایڈیشنوں کا ذکر ہوا تھا، ان کے متعلقہ اقتباسات کے متن اور مندرجہ بالا انگریزی ترجمے میں جو ''فوائد الفواد'' کے حوالے سے ہے، کوئی فرق نہیں۔ وہ ذی علم حضرات جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے سیرت نگار اور ''فوائد الفواد'' کے مستقل قاری ہیں، اس رائے کے حامل ہیں کہ ''فوائد الفواد'' کے فارسی نسخے مطبوعہ لاہور-۱۹۶۶ء اور اس کے دونوں اردو تراجم میں جہاں اس بارے میں صرف شیخ سعدالدین حمویہ اور باباصاحب کی وفات کے درمیان تین برس کا فرق خواجہ نظام الدین اولیاء سے منسوب کیا گیا ہے، ان نسخوں کا متن نامکمل ہے اور ''فوائد الفواد'' کا مکمل متن وہی ہونا چاہئے جو ''سیرالاولیاء'' یا ''فوائد الفوائد'' مندرجہ بالا انگریزی اقتباس میں دیا گیا ہے۔ ہم اسی بنیاد پر آگے تبصرہ کریں گے۔ جو حضرات اس رائے سے اختلاف رکھتے ہوں، ان کے لئے تحقیق کا دروازہ کھلا ہے اور وہ شیخ سعدالدین حمویہ کے سنہ وصال کا صحیح تعین کرنے کے بعد، اس میں تین برس جمع کرکے، اپنے نتائج سے دوسروں کو بھی مستفید کریں۔

تیسرا اشارہ خربوزوں کا موسم:

یہ اشارہ ''فوائد الفواد'' کی دوسری جلد کی آٹھویں مجلس میں ہے جو ستائیس (۲۷) ربیع الاول ۷۱۰ھ (مطابق ۲۴/اگست ۱۳۱۰ء) کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ چوں کہ فارسی متن اور اس کے اردو اور انگریزی تراجم میں کوئی فرق نہیں، اس لئے متعلقہ اقتباس کا صرف ایک اردو ترجمہ نیچے پیش کیا جارہا ہے جو خواجہ حسن ثانی نظامی کے ترجمے کے صفحہ نمبر ۲۳۲ پر ہے:

''جب شیخ (باباصاحب) کی بیماری بڑھی اور رمضان کا مہینہ آیا تو حضرت افطار فرماتے تھے (یعنی روزہ نہ رکھتے تھے) ایک روز کوئی خربوزہ لایا۔ اس کی قاشیں کرکے شیخ کے سامنے رکھی گئیں، شیخ انہیں تناول فرمارہے تھے۔ اس دوران خربوزے کی ایک قاش مجھے بھی مرحمت فرمائی، میں نے چاہا کہ کھالوں۔ دل میں خیال تھا کہ دوماہ تک متواتر روزے رکھ کر اس

کا کفارہ ادا کروں گا۔ یہ دولت کہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی چیز عنایت فرماتے ہیں، پھر کہاں ملے گی۔ چنانچہ قریب تھا کہ میں اسے کھا لیتا کہ حضرت نے (ٹوکا اور) کہا کہ نہیں مت کھاؤ۔ مجھے تو شریعت کی طرف سے اجازت ہے، تمہیں نہیں کھانا چاہئے۔''

اب ان اشاروں پر تبصرے ملاحظہ ہو۔

پہلا اشارہ ہندوستان پر منگولوں (مغلوں) کی یلغار تو سلطان شمس الدین التمش کے عہد سے ہی شروع ہوگئی تھی اور غیاث الدین تغلق کے دور میں بھی جاری رہی، چنانچہ اس اشارے میں کافروں سے مراد منگول، علاقے سے مراد ملتان اور وہاں تک پہنچ جانے کی ایک توضیح، ملتان کی بربادی یا تسخیر بھی ہوسکتی ہے، سوال یہ ہے کہ تاریخ ہند کے مطابق وہ کون سا سنہ تھا جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے ان ملفوظات، یا اس کی مندرجہ بالا توضیح، سے مطابقت رکھتا ہو۔ اشارے کا تعلق چونکہ ملتان سے ہے، اس لئے ہم نے ملتان کی تاریخ پر مولانا نور احمد خان فریدی کی کتاب ''تاریخ الملتان'' سے رجوع کیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کتاب سے اقتباس یہ ہے:

تاریخ ملتان　مصنف مولانا نور احمد خان فریدی　ناشر: قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر　سال اشاعت: نہیں دیا۔

جلد اول کے صفحہ نمبر ۲۱۸ پر تحریر ہے:

''ذی الحجہ ۶۸۳ھ (فروری ۱۲۸۵ء) میں دفعتاً اطلاع ملی کہ تیمور خان مغل تیس ہزار فوج کے ہمراہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سلطان محمد (بلبن کے بیٹے اور ملتان کے گورنر کا نام محمد سلطان تھا۔) نے ''سی'' (۳۰) ہزار کو ''سہ'' (۳) ہزار پڑھا۔ جس پر یہ دس ہزار سواروں کے ہمراہ لاہور پہنچا اور راوی کے کنارے کافروں سے لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔''

مندرجہ بالا اقتباس پر ہمارے تین تبصرے ہیں۔ اول بابا صاحب کے سال وصال کے بارے میں جو روایتیں ہمارے علم میں ہیں، ان میں سے کوئی ۶۸۴ھ (مطابق ۱۲۸۵ء) نہیں۔ ثانیاً یہ جنگ لاہور میں راوی کے کنارے ہوئی جب کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں ذکر اس بات کا ہے کہ منگول ''علاقے'' یعنی ملتان میں پہنچ گئے، یا ملتان پر حملہ آور ہوئے۔ ثالثاً ذی الحجہ ۶۸۳ھ یا ۶۸۴ھ کے اوائل کا تعلق ۱۲۸۵ء سے ہے جو بلبن کی بادشاہت (۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء تک) کے

بالکل آخری دور کی بات ہے جب کہ معتبر مورخین کے مطابق بابا صاحب کا انتقال بلبن کے سلطان دہلی بنے کے ابتدائی دور میں ہوا، نہ کہ آخری دور میں۔ اگر بابا صاحب کا انتقال تیرھویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی (کے آخری نصف حصے یعنی ۱۲۶۶ء سے ۱۲۷۰ء تک) میں ہوا تو یہ غالباً بلبن کا ابتدائی دور کہلائے گا، اگر بیسویں صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی (کے پہلے نصف حصے کے آخر یعنی ۱۲۸۵ء) میں ہوا تو یہ یقیناً بلبن کا آخری دور حکومت کہلائے گا، ابتدائی دور حکومت نہیں کہلا سکتا۔

اگر بابا صاحب کا کوئی عقیدت مند جو تاریخ پاک و ہند پر دسترس رکھتا ہو، خواجہ نظام الدین اولیا کے اس اشارے کی روشنی میں، تاریخ ملتان اور تاریخ پاک و ہند کی مستند کتابوں کے ذریعے اس برس کا تعین کرسکے جب منگولوں نے ملتان پر یلغار کی یا اسے تاراج یا تسخیر کیا تو اس سے بابا صاحب کے سال وصال کے صحیح تعین میں بہت مدد ملے گی۔

دوسرا اشارہ ''سیر الاولیاء'' کے مطابق، بابا صاحب کی وفات شیخ بہاء الدین زکریا کی رحلت کے تین برس بعد ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مختلف مورخین، محققین، سیرت نگاروں کی کتب اور انسائیکلوپیڈیا میں، شیخ بہاء الدین زکریا کا سال وصال کیا بتایا گیا ہے۔ اس کے بارہ حوالے درج ذیل ہیں:

(۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم- The life AND Times of Shaikh Fariduddin Gang-I. Shakar

صفحہ نمبر ۴۷ کے حاشیے میں ہے، شیخ بہاء الدین زکریا کا سال وصال ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۲ء لکھا ہے۔

(۲) پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی　ماہنامہ ''منادی'' دہلی (ستمبر ۱۹۷۴ء) صفحات: ۱۶۵ اور ۱۶۹

پہلے صفحہ نمبر ۱۶۵ پھر صفحہ نمبر ۱۶۹ پر، مضمون بعنوان ''اسرار الاولیاء- ایک تنقیدی جائزہ'' میں شیخ بہاء الدین زکریا کا سال وصال ۶۶۱ھ بتایا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۶۹ پر درج شدہ سال وصال ''سیر الاولیاء'' کے حوالے سے ہے (جو ماہنامہ ''منادی'' کے صفحہ نمبر ۱۴۵ پر ہے اور مشتبہ لگتا ہے) اور صفحہ ۱۶۵ پر درج شدہ سال وصال ''اخبار الاخیار'' کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ ''اخبار الاخیار'' کے اس اردو ترجمے میں جو اقبال الدین احمد نے کیا اور ۱۹۹۷ء میں دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی سے شائع ہوا صفحہ نمبر ۵۰ پر تحریر ہے ''شیخ زکریا نے ۷ رصفر ۶۶۱ھ کو جام بقا نوش کیا۔''

(۳) شیخ محمد اکرام　''آب کوثر'' سال تصنیف: ۱۹۳۷ء سولھویں ایڈیشن کا سال اشاعت: ۱۹۹۶ء

ناشر: ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور　صفحہ: ۲۶۱

''(شیخ بہاء الدین زکریا) کی وفات ۶۶۱ھ/ ۱۲۶۲ء میں ہوئی۔''

(۴) ''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' (اردو اسلامک انسائکلوپیڈیا) پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد نمبر ۵ سال اشاعت: ۱۹۸۵ء صفحہ نمبر: ۹۵ آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کا انتقال سات صفر ۶۶۱ھ/۲۱/دسمبر ۱۲۶۲ء کو ملتان میں ہوا۔

(۵) محکمۂ اوقاف حکومت پنجاب

محکمۂ اوقاف، حکومت پنجاب نے شیخ زکریا کے مزار کے سرہانے ایک بورڈ پر آپ کے کوائف دیئے ہیں جس کے مطابق آپ کی ''تصدیق شدہ'' تاریخ وفات ۷/صفر ۶۶۱ھ بتائی گئی ہے۔

(۶) مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم ''شاہ رکن عالم ملتانی سہروردی قدس سرہٗ'' سال تصنیف: ۱۳۸۰ھ (مطابق ۱۹۶۰ء ناشر: قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر سال اشاعت: درج نہیں صفحہ نمبر: ۳۵

''۷/صفر ۶۶۱ھ کو.......... خواجہ بہاء الحق.......... سرائے فانی سے عالم بقا کو انتقال کر گئے۔''

(۷) مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم ''تاریخ ملتان'' سال تصنیف و اشاعت: درج نہیں۔ ناشر: قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر صفحات: ۱۳۹، ۱۷۹، ۱۸۵

(۱) صفحہ نمبر ۱۳۹۔ جلد اول

''رحلت ۷/صفر المظفر ۶۶۱ھ''

(۲) صفحہ نمبر ۱۷۹۔ جلد اول

''۷/صفر ۶۶۱ھ بروز منگل.......... حضرت (صدر الدین) عارف باللہ گھبرا کر واپس لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت (بہاء الدین زکریا) کا سر نیاز سجدے میں ہے اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر چکی ہے۔''

(۳) صفحہ نمبر ۱۸۵۔ جلد اول

''..........''العزیز''، بہاول پور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں صاحب مضمون نے تحریر کیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام (بہاء الدین زکریا) نے سید علی ہجویری کی مشہور عالم تصنیف ''کشف المحجوب'' کو بھی اپنے ہاتھ سے سپرد قلم فرمایا تھا..........حال ہی میں جناب احمد ربانی صاحب نے محکمۂ اوقاف کی اعانت سے ''کشف المحجوب'' کا ایک فارسی نسخہ طبع

کرایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔ انہوں نے اس نسخے کا (کے) پہلے اور آخری صفحے کا عکس بھی دیا ہے مگر اسے حضرت شیخ الاسلام (بہاء الدین زکریا) سے منسوب کرنے میں چند اشکال حائل ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر تاریخ ارقام ۶۶۴ھ درج ہے حالانکہ حضرت کا سن وصال بالاتفاق ۶۶۱ھ ہے۔''

(۸) سید صباح الدین عبدالرحمٰن ''بزم صوفیہ'' سال تصنیف: ۱۹۵۰ء ناشر: مطبع معارف دار المصنفین، اعظم گڑھ، بھارت سال اشاعت: پہلا ایڈیشن: ۱۹۵۰ء دوسرا ایڈیشن: ۱۹۷۱ء صفحہ: ۱۳۰

سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ ''راحۃ القلوب'' میں سال وفات ۶۵۶ھ، ''سیر الاولیاء'' (ص ۹۱) میں ۶۶۷ھ، ''اخبار الاخیار'' میں ۶۶۱ھ، ''سفینۃ الاولیاء'' اور ''فرشتہ'' میں ۶۶۶ھ اور مرآۃ الاسرار میں ۵۶۵ھ ہے۔''

(۹) ''مرآۃ الاسرار'' مصنف: شیخ عبدالرحمٰن چشتی (دوسرے کوائف اوپر درج کیے جا چکے ہیں۔) صفحہ: ۷۰۰، ۷۷۱

(۱) صفحہ نمبر ۷۰۰: آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کا وصال سات ماہ صفر ۶۶۵ھ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہوا۔''

[illegible]

پ (بابا صاحب) کی وفات سہ شنبہ (منگل) کے دن پانچویں ماہ محرم ۶۶۸ھ، اور دوسری روایت ے مطابق [illegible] ھ میں، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی۔

(۱۰) ''سفینۃ الاولیاء'' مصنف: دارا شکوہ کوائف مضمون کے پہلے حصے میں دیئے جا چکے ہیں صفحہ نمبر ۱۵۲

آپ (شیخ بہاء الدین زکریا) کی وفات جمعرات کے دن.......... ۷/ماہ صفر ۶۶۶ھ کو ہوئی۔ [واضح رہے کہ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۳ پر، بابا صاحب کا سال وصال (۵ محرم) ۶۶۴ھ بتایا گیا ہے، یعنی بابا صاحب دو برس پہلے انتقال کر گئے تھے۔]

(۱۱) ''آئین اکبری'' مصنف: ابو الفضل، کوائف مضمون کے تیسرے حصے میں دیئے جا چکے ہیں۔

جلد دوئم کے صفحہ نمبر ۳۲۸ پر تحریر ہے:

''(شیخ بہاء الدین زکریا نے) ۶۶۵ ہجری ماہِ صفر میں.......رحلت فرمائی۔''

(۱۲) ''مخبرالواصلین'' مؤلف: ابوعبداللہ محمد فاضل بن سید حسن حسینی ترمذی اکبرآبادی

کوائف مضمون کے تیسرے حصے میں ہیں۔

صفحہ نمبر ۵۶ : ''تاریخ رحلت'': بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرّہٗ:

''شاہ بازِ مقام علیین'' ۶۶۷ھ

اس مضمون کے پہلے حصہ میں، جب پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی، شیخ محمد اکرام مرحوم، مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحریروں سے وہ اقتباسات دیئے گئے تھے جن کے مطابق ۶۶۴ھ کو باباصاحب کا سالِ وصال بتایا گیا ہے تو سوال اٹھا تھا: ۶۶۴ھ کی روایت کہاں سے چلی؟ اس کا جواب آنا ابھی باقی ہے، گو نظر ''سیرالاولیاء'' کی طرف اٹھتی ہے۔

اوپر کی سطروں میں، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، شیخ محمد اکرام مرحوم، پنجاب یونیورسٹی کی ''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' اور مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم کی تحریروں سے وہ اقتباسات دیئے گئے ہیں جن کے مطابق شیخ بہاء الدین زکریا کا انتقال ۶۶۱ھ میں ہونا بتایا گیا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال اٹھتا ہے۔ ۶۶۱ھ کی روایت کہاں سے چلی؟

''سیرالاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے، سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی کتاب ''بزم صوفیہ'' کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر، شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۷ھ درج کیا ہے، جب کہ ''سیرالاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے ہی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ماہنامہ ''منادی'' دہلی ستمبر ۱۹۷۴ء کے صفحہ نمبر ۱۴۵ پر، چار صوفیائے کرام کے سنینِ وصال درج کرتے ہوئے، ۶۶۱ھ کو شیخ بہاء الدین زکریا کے سنہ وصال کے طور پر درج کر چکے ہیں۔

اب تحقیق طلب بات یہ ہے کہ ''سیرالاولیاء'' کے جس ایڈیشن کے صفحہ نمبر ۹۱ سے پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی اور سید صباح الدین عبدالرحمن دونوں نے استفادہ کیا ہے (اور یہ ایڈیشن چرنجی

لال کا ۱۸۸۵ء - دہلی ایڈیشن ہوسکتا ہے۔) اس میں شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال کیا لکھا ہے؟ ۶۶۱ھ لکھا ہے؟ ۶۶۷ھ لکھا ہے؟ یا کوئی سنہ بھی تحریر نہیں (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔)

ہمارا دوسرا تبصرہ یہ ہے کہ تاریخ ملتان (جلد اول) کے صفحہ نمبر ۱۸۵ پر، مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم کی یہ قطعی رائے کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال ''بالاتفاق'' ۶۶۱ھ ہے، سید صباح الدین عبدالرحمن کی کتاب ''بزم صوفیہ'' کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر چھ کتابوں کے جو حوالے دیئے گئے ہیں، اس سے عیاں ہے کہ یہ چھے کتب اگر متفق ہیں تو صرف اس نکتے پر کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۱ھ نہیں تھا۔ ان چھے کتب میں سے پانچ کتابوں میں شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال ۶۶۱ھ کے علاوہ کوئی اور سنہ درج ہے، گو یہاں بھی غالباً کاتب کی بداحتیاطی اور پروف پڑھنے والے کی سہو سے، شیخ بہاء الدین زکریا کا سالِ وصال ۶۶۵ھ کے بجائے، جو مرآۃ الاسرار میں درج ہے، ۵۶۵ھ چھپ گیا ہے، جو کوئی ایسی قابل گرفت بات نہیں۔

یوں لگتا ہے کہ جس طرح ماہنامہ ''منادی'' دہلی کے ''حضرت بابا فرید نمبر'' (ستمبر ۱۹۷۴ء) میں، پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی نے اپنے علم کی بنا پر یہ قطعی رائے قائم کر لی تھی کہ باباصاحب کا سالِ وصال ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) ہے اور ''منادی'' کے اس شمارے میں شائع شدہ اپنے عالمانہ اور محققانہ مضامین میں اپنی بات کا آغاز، ایک سے زیادہ بار، یہ کہہ کر کیا تھا کہ ''ہمیں معلوم ہے کہ باباصاحب نے ۶۶۴ھ میں.......انتقال فرمایا ہے۔''، اسی طرح مولانا نور احمد خاں فریدی مرحوم نے بھی اپنے علم کی بنا پر یہ قطعی رائے قائم کر لی کہ شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہ وفات ۶۶۱ھ ہے اور اس بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی ورنہ وہ یہ ہرگز نہ لکھتے کہ ''حضرت بہاء الدین زکریا کا سنہ وصال ۶۶۱ھ ہے۔'' اسی طرح وہ ''کشف المحجوب'' کے اس نسخے کو جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے شیخ بہاء الدین زکریا نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس پر اپنے دستخط کے ساتھ ۶۶۴ھ کا سنہ درج کیا ہے، شک کی نظر سے نہ دیکھتے اور یہ طنزیہ فقرہ نہ لکھتے کہ ''ان کا دعویٰ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کی ڈھنڈیا پڑ رہی تھی۔''

ہمارا تیسرا اور آخری تبصرہ یہ ہے کہ ''مرآۃ الاسرار'' اور ''آئین اکبری'' کے مطابق، باباصاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا دونوں کا انتقال سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوا۔ یہ بات

''مرآۃ الاسرار'' میں تو صراحتہً لکھی گئی ہے۔غیاث الدین بلبن فروری ۱۲۶۶ء (مطابق جمادی الاول ۶۶۴ھ) میں سلطان بنا۔''مرآۃ الاسرار'' اور ''آئین اکبری'' کے مطابق شیخ بہاء الدین زکریا کا انتقال صفر ۶۶۵ھ (نومبر ۱۲۶۶ء) اور باباصاحب کا انتقال محرم ۶۶۸ھ (مطابق ستمبر ۱۲۶۹ء) میں ہوا۔ان دونوں کتابوں میں ان دونوں صوفیائے کرام کے درج شدہ سالہائے وصال میں تقریباً تین برس کا وہی وقفہ ہے جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے فرمودے سے مطابقت رکھتا ہے۔

تیسرا اشارہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے تیسرے اشارے کے بارے میں، ڈاکٹر منظور ممتاز نے ''پیام گنج شکرؒ'' میں ایک نکتہ آفریں بحث کا آغاز کیا ہے۔صفحہ نمبر ۵۸ پر، وہ لکھتے ہیں:۔

(ا) ''جس سن (سنہ) کے پانچ محرم کو حضرت باباجیؒ نے انتقال فرمایا، اس سے پہلے رمضان میں حضرت باباجی پر بیماری غالب آچکی تھی اور اس رمضان میں خربوزے کی فصل کا موسم تھا جو کہ پاک پتن (اجودھن) ساہیوال وغیرہ میں مئی جون میں ہوتا ہے اور اب بھی ہے کہ جون کے اواخر اور جولائی میں برسات کا موسم شروع ہو جاتا ہے اور خربوزے کی فصل ختم ہو جاتی ہے۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں ''۶۶۲ھ، ۶۶۳ھ اور ۶۶۴ھ وہ تین سال ہیں جن میں رمضان جون میں آیا اور ۶۶۵ھ، ۶۶۶ھ اور ۶۶۷ھ وہ تین برس ہیں جن میں رمضان مئی میں آیا۔''

اس حقیقت کشابیان کے بعد، ڈاکٹر منظور ممتاز جس پُر پیچ بحث میں الجھ گئے، اس سے انھوں نے، چند صفحات بعد، کتاب کے صفحہ نمبر ۶۳ پر یہ غلط نتیجہ اخذ کیا (جس کا ذکر ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں) کہ ''حضرت باباجی کا وصال منگل چار محرم ۶۶۵ھ کو آدھی رات کے لگ بھگ ہوا اور تدفین پانچ محرم ۶۶۵ھ بروز بدھ ہوئی جو ۱۶/ اکتوبر ۱۲۶۶ء تھی۔ یہاں بھی ڈاکٹر منظور ممتاز، ان کے کاتب یا ان کی کتاب کے پروف پڑھنے والے سے یہ غلطی ہوئی کہ چھے اکتوبر کو غلطی سے سولہ اکتوبر لکھ گئے، گو اس سے پہلے، کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰ پر، انھوں نے باباصاحب کی تاریخ وفات، دومرتبہ، چھے (۶) اکتوبر ہی لکھی ہے جو نتیجے کے اعتبار سے غلط لیکن تقویم کے لحاظ سے پانچ محرم ۶۶۵ھ سے مطابقت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر منظور ممتاز کی کتاب میں ''چھے'' اور ''سولہ'' اکتوبر کی غلطی تو بظاہر کاتب کی چوک لگتی ہے لیکن خود ڈاکٹر منظور ممتاز سے ایک بڑی اور بدیہی چوک یہ ہوگئی کہ انھوں نے پاک پتن میں خربوزوں کے موسم کو صرف مئی اور جون کے دوماہ تک محدود رکھا، حالانکہ اس میں اپریل کا مہینا بھی شامل

کرنا چاہئے تھا۔

کیوں کرنا چاہئے تھا؟ یہ اس جدول سے واضح ہو جائے گا جو رمضان ۶۶۲ھ سے رمضان ۶۷۲ھ تک، گیارہ برس کے دوران ہونے والے عیسوی تقویم کے سال، ماہ اور تاریخ کی نشان دہی کرتی ہے۔اس ضمن میں، ''تاج العارفین'' کے مصنف اور چشتیاں، ضلع بہاول نگر کے اہل قلم جناب محمد اجمل چشتی کا یہ تبصرہ بھی مدنظر رہے کہ ''پنجاب میں خربوزے کی فصل ماہ بیساکھ میں تیار ہوتی ہے، یعنی نصف اپریل اور نصف مئی کے دوران'' محمد اجمل چشتی صاحب کا یہ تبصرہ ان کے خط میں درج ہے جو انھوں نے دس اکتوبر ۲۰۰۰ء کو راقم الحروف کو تحریر کیا تھا۔جدول یہ ہے

پہلی جدول

نمبر شمار	گیارہ برس رمضان ۶۶۲ھ، رمضان ۶۷۲ھ	ماہ رمضان کی ان تاریخوں میں عیسوی کیلنڈر کی کیا تاریخیں تھیں؟	وصال کا دن	تاریخ وفات اور سال وصال	
				مطابق قمری تقویم	مطابق عیسوی تقویم
۱	یکم رمضان ۶۶۲ھ تا تیس رمضان ۶۶۲ھ	۲۷ جون ۱۲۶۳ء تا ۲۶ جولائی ۱۲۶۳ء	منگل	۵ محرم ۶۶۳ھ	۲۸/ اکتوبر ۱۲۶۳ء
۲	" ۶۶۳ھ " ۶۶۳ھ	۱۷ جون ۱۲۶۵ء تا ۱۶ جولائی ۱۲۶۵ء	ہفتہ	" ۶۶۴ھ	۱۷/ اکتوبر ۱۲۶۵ء
۳	" ۶۶۴ھ " ۶۶۴ھ	۶ جون ۱۲۶۶ء تا ۵ جولائی ۱۲۶۶ء	بدھ	" ۶۶۵ھ	۶/ اکتوبر ۱۲۶۶ء
۴	" ۶۶۵ھ " ۶۶۵ھ	۲۶ مئی ۱۲۶۷ء تا ۲۴ جون ۱۲۶۷ء	پیر	" ۶۶۶ھ	۲۶/ ستمبر ۱۲۶۷ء
۵	" ۶۶۶ھ " ۶۶۶ھ	۱۵ مئی ۱۲۶۸ء تا ۱۳ جون ۱۲۶۸ء	جمعہ	" ۶۶۷ھ	۱۳/ ستمبر ۱۲۶۸ء
۶	" ۶۶۷ھ " ۶۶۷ھ	۴ مئی ۱۲۶۹ء تا ۲ جون ۱۲۶۹ء	بدھ	" ۶۶۸ھ	۳/ ستمبر ۱۲۶۹ء
۷	" ۶۶۸ھ " ۶۶۸ھ	۲۴/ اپریل ۱۲۷۰ء تا ۲۳ مئی ۱۲۷۰ء	اتوار	" ۶۶۹ھ	۲۴/ اگست ۱۲۷۰ء
۸	" ۶۶۹ھ " ۶۶۹ھ	۱۳/ اپریل ۱۲۷۱ء تا ۱۲/ مئی ۱۲۷۱ء	جمعرات	" ۶۷۰ھ	۱۳/ اگست ۱۲۷۱ء
۹	" ۶۷۰ھ " ۶۷۰ھ	یکم اپریل ۱۲۷۲ء تا ۳۰/ اپریل ۱۲۷۲ء	منگل	" ۶۷۱ھ	۲/ اگست ۱۲۷۲ء
۱۰	" ۶۷۱ھ " ۶۷۱ھ	۲۲/ مارچ ۱۲۷۳ء تا ۲۰/ اپریل ۱۲۷۳ء	ہفتہ	" ۶۷۲ھ	۲۲/ جولائی ۱۲۷۳ء
۱۱	" ۶۷۲ " ۶۷۲ھ	۱۱/ مارچ ۱۲۷۴ء تا ۹/ اپریل ۱۲۷۴ء	بدھ	" ۶۷۳ھ	۱۱/ جولائی ۱۲۷۴ء

(ماخذ: ''تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ: ابو النصر محمد خالدی

ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی سال اشاعت (سوئم): ۱۹۷۴ء)

مندرجہ بالا جدول میں، وہ گیارہ قمری برس درج کئے گئے ہیں جب ماہ رمضان کا آغاز یا اختتام، اس دور میں، اپریل سے جون کے مہینوں میں ہوا، خواہ اپریل، مئی اور جون کے ان مہینوں میں ایک آدھ روزہ ہی آیا ہو۔

اس جدول میں دی ہوئی تاریخوں کا مقابلہ، ڈاکٹر منظور ممتاز کے اس بیان سے کیجئے کہ ''۶۶۵ھ، ۶۶۶ھ اور ۶۶۷ھ وہ تین برس ہیں جن میں رمضان مئی میں آیا۔'' (پیام گنج شکرؒ۔صفحہ ۵۸)، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تین قمری برسوں یعنی ۶۶۵ھ اور ۶۶۶ھ اور ۶۶۷ھ میں، رمضان کی ابتداء تو ضرور ماہ مئی میں ہوئی، یعنی یکم رمضان ۶۶۵ھ کو ۲۶ مئی ۱۲۶۷ء تھی، یکم رمضان ۶۶۶ھ کو ۱۵ مئی ۱۲۶۸ء تھی اور یکم رمضان ۶۶۷ھ کو ۴ مئی ۱۲۶۹ء تھی، لیکن رمضان کے تیئیس (۲۳) روزے ۶۶۸ھ میں، ماہ مئی ۱۲۷۰ء کے دوران آئے اور بارہ (۱۲) روزے ۶۶۹ھ مئی ۱۲۷۱ء میں آئے۔

دوسرے الفاظ میں، اس دور میں، ۶۶۵ھ، ۶۶۶ھ اور ۶۶۷ھ ہی صرف وہ تین برس نہیں جن میں رمضان کے روزے مئی میں آئے بلکہ ۶۶۵ھ سے ۶۶۹ھ تک، پانچ قمری سالوں میں، ماہ رمضان کے روزے ماہ مئی میں آتے رہے اور مئی کے یہ مہینے پانچ سال یعنی ۱۲۶۷ء، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰ء اور ۱۲۷۱ء سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگر ہم، بوجوہ، صرف ماہ مئی تک ہی محدود رہیں (جو غیاث الدین بلبن کی تخت نشینی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔) تو بھی مندرجہ بالا جدول کے مطابق، بابا صاحب کا سالِ وصال (پانچ محرم) ۶۶۶ھ سے (پانچ محرم) ۶۷۰ھ کے درمیان، پانچ برسوں میں، کسی برس (پانچ محرم) کو ہوا۔ اگر ہم محمد اجمل چشتی صاحب کے مطابق، اس بنیاد پر چلیں کہ خربوزے کی فصل ماہ بیساکھ، یعنی وسط اپریل سے وسط مئی کے درمیان میں ہوئی ہے تو اس دور میں ماہ رمضان کا کہیں صرف ایک آدھ روزہ اور کہیں تقریباً سارا ماہ رمضان (۲۷ روزے) ۶۶۶ھ اور ۶۷۱ھ (۱۲۶۸ء تا ۱۲۷۳ء) کے درمیان کے چھے برسوں میں پڑتے ہیں، یہ حساب کتاب واضح کرنے کے لئے دوسری جدول پیش ہے:

دوسری جدول

نمبر شمار	رمضان	عیسوی تقویم کے مطابق تاریخ	وسط اپریل ۱۶/اپریل تا ۳۰/اپریل	وسط مئی یکم مئی تا پندرہ مئی	روزوں کی تعداد		رمضان میں کل روزوں کی تعداد
					وسط اپریل	وسط مئی	
۰	۶۷۲ھ	۱۱/مارچ ۱۲۷۳ء تا ۹/اپریل ۱۲۷۳ء	اس عرصے میں وسط اپریل آیا نہ وسط مئی		×	×	×
۱	۶۷۱ھ	۲۲/مارچ ۱۲۷۳ء تا ۲۰/اپریل ۱۲۷۳ء	۱۶/اپریل تا ۳۰/اپریل	یکم مئی تا پندرہ مئی	۵	×	★۵
۲	۶۷۰ھ	یکم اپریل ۱۲۷۲ء تا ۳۰/اپریل ۱۲۷۲ء	۔	۔	۱۵	×	☆۱۵
۳	۶۶۹ھ	تیرہ اپریل ۱۲۷۱ء تا ۱۲ مئی ۱۲۷۱ء	۔	۔	۱۵	۱۲	◉۲۷

نمبر شمار	رمضان	عیسوی تقویم کے مطابق تاریخ	وسط اپریل ۱۶/اپریل تا ۳۰/اپریل	وسط مئی یکم مئی تا پندرہ مئی	وسط اپریل	وسط مئی	رمضان میں کل روزوں کی تعداد
۴	۶۶۸ھ	۲۴/اپریل ۱۲۷۰ء تا ۲۳ مئی ۱۲۷۰ء	اس عرصے میں وسط اپریل آیا نہ وسط مئی		۷	۱۵	۲۲+
۵	۶۶۷ھ	۴/مئی ۱۲۶۹ء تا ۲/جون ۱۲۶۹ء	۱۶/اپریل تا ۳۰/اپریل	یکم مئی تا پندرہ مئی	×	۱۲	××۱۲
۶	۶۶۶ھ	۱۵/مئی ۱۲۶۸ء تا ۱۳/جون ۱۲۶۸ء	۔	۔	×	۱	×××۱
۷	۶۶۵ھ	۲۶/مئی ۱۲۶۷ء تا ۲۴/جون ۱۲۶۷ء	۔	۔	×	×	×
۸	۶۶۴ھ	۶/جون ۱۲۶۶ء تا ۵/جولائی ۱۲۶۶ء	۔	۔	×	×	×
۹	۶۶۳ھ	۱۷/جون ۱۲۶۵ء تا ۱۶/جولائی ۱۲۶۵ء	۔	۔	×	×	×

★ رمضان ۶۷۱ھ کے ۵ روزے: ۱۶/اپریل ۱۲۷۳ء سے ۲۰/اپریل ۱۲۷۳ء تک

☆ رمضان ۶۷۰ھ کے ۱۵ روزے: ۱۶/اپریل ۱۲۷۲ء سے ۳۰/اپریل ۱۲۷۲ء تک

◉ رمضان ۶۶۹ھ کے ۲۷ روزے: ۱۶/اپریل ۱۲۷۱ء سے ۳۰/اپریل ۱۲۷۱ء تک + یکم مئی ۱۲۷۰ء سے ۱۲ مئی ۱۲۷۱ء تک

+ رمضان ۶۶۸ھ کے ۲۲ روزے: ۲۴/اپریل ۱۲۷۰ء سے ۳۰/اپریل ۱۲۷۰ء تک + یکم مئی ۱۲۷۰ء سے پندرہ مئی ۱۲۷۰ء تک

×× رمضان ۶۶۷ھ کے ۱۲ روزے: ۴ مئی ۱۲۶۹ء سے ۱۵ مئی ۱۲۶۹ء تک

××× رمضان ۶۶۶ھ کا ایک روزہ: ۱۵ مئی ۱۲۶۸ء

مندرجہ بالا جدول کے مطابق، یکم رمضان ۶۶۳ھ کو ۱۷ جون ۱۲۶۵ء تھا جب اس علاقے میں خربوزوں کا موسم گزر چکا تھا چنانچہ یہ روایت کہ بابا صاحب کا انتقال اس کے چار ماہ بعد، ۵ محرم ۶۶۴ھ (مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۲۶۵ء) کو ہوا، جو ''سیر الاولیاء'' کے (بعض) قلمی نسخوں سے چلی اور جس کی تقلید بیشتر سیرت نگاروں نے کی، درست نہیں ہے۔ تاہم اس تاریخ کو بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر تسلیم نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ وہ خارجی تاریخی شہادت ہے کہ غیاث الدین بلبن جمادی الاول ۶۶۴ھ (مطابق فروری ۱۲۶۶ء) میں سلطانِ دہلی بنا۔ ''تاریخِ فیروز شاہی'' اور ''مرآۃ الاسرار'' کے مطابق، بابا صاحب کی وفات سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہوئی جو ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء تک ہے۔ اس طرح ۵ محرم ۶۶۴ھ (مطابق سترہ اکتوبر ۱۲۶۵ء) بابا صاحب

کی تاریخ وفات نہیں ہوسکتی۔

پانچواں حصہ اس میں نتائج سے بحث کی جائے گی۔

(۱) ٹھوس داخلی اور خارجی شواہد کی بنا پر، ۶۶۴ھ (مطابق ۱۲۶۵ء) کو بابا صاحب کا سنہِ وصال سمجھنا درست نہیں ہے۔

(۲) خواجہ نظام الدین اولیاء کے اس فرمودے کی روشنی میں کہ بابا صاحب کی وفات شیخ بہاء الدین زکریا کی رحلت کے تین برس بعد ہوئی، ۶۶۱ھ (مطابق ۱۲۶۲ء) کو شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہِ وصال سمجھنا درست نہیں ہے۔ واضح رہے کہ اگر ۶۶۱ھ کو شیخ بہاء الدین زکریا کا سنہِ وصال مان لیا جائے تو تین برس بعد، ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کا سنہِ وصال قرار دینا ہوگا اور ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ٹھوس داخلی اور خارجی شواہد کی بنا پر یہ درست نہیں ہے۔

(۳) مضمون کے چوتھے حصے میں دی ہوئی پہلی جدول میں ۶۶۲ھ سے ۶۷۲ھ تک وہ گیارہ قمری سال درج کئے گئے تھے جب ماہ رمضان کا آغاز یا اختتام، اُس دور میں، اپریل سے جون کے تین مہینوں کے دوران ہوا، خواہ ان تین مہینوں میں رمضان کا ایک آدھ روزہ ہی آیا ہو، اب ہم رمضان کے بعد آنے والے گیارہ قمری برسوں یعنی ۶۶۳ھ سے ۶۷۳ھ تک، ہر سال کا جائزہ لیکر یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان میں بابا صاحب کے وصال کے وقوع ہونے کے کیا امکانات ہیں۔

گیارہ برسوں کا جائزہ (۶۶۳ھ تا ۶۷۳ھ)

نمبر شمار	تاریخ		دن	تبصرہ/جائزہ
	قمری	عیسوی		
۱	۵ محرم ۶۶۳ھ	۲۸/اکتوبر ۱۲۶۴ء	منگل	بابا صاحب بلبن کے عہد سلطانی کے ابتدائی دور میں زندہ تھے۔ بلبن کا عہد سلطانی گیارہ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ (مطابق اٹھارہ فروری ۱۲۶۶ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اگر بابا صاحب مندرجہ بالا تاریخوں میں زندہ تھے، تو برس بھر پہلے کی کوئی تاریخ ان کا سنہِ وصال نہیں ہوسکتی۔ ۶۶۳ھ کا بطور سالِ وصال ذکر سلیم یزدانی صاحب کے علاوہ مولوی نور احمد چشتی کے ایک تاریخی قطعہ پر مبنی ہے جو

				''آکھیا بابا فریدؒ نے'' نامی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹ پر درج ہے۔ یہ سالِ وصال درست نہیں ہوسکتا۔
۲	۵ محرم ۶۶۴ھ	۱۷/اکتوبر ۱۲۶۵ء	ہفتہ	سیرت نگاروں کی اکثریت ۶۶۴ھ کو بابا صاحب کے سنہِ وفات کے طور پر لکھتی رہی ہے، چنانچہ اس مضمون میں تفصیلی جائزہ لے کر، یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سالِ وصال درست نہیں ہوسکتا۔ اس کی بنیاد ''سیر الاولیاء'' بتائی جاتی ہے۔
۳	۵ محرم ۶۶۵ھ	۶/اکتوبر ۱۲۶۶ء	بدھ	یہ بلبن کے عہد سلطانی کے ابتدائی دور میں پانچ محرم کی اولین تاریخ ہے۔ اس کا ذکر صرف ''پیام گنج شکر'' کے مصنف ڈاکٹر منظور ممتاز نے کیا ہے۔ ہمیں ڈاکٹر منظور ممتاز کے طرز استدلال سے اتفاق ہے نہ ان کے اخذ کردہ نتیجے سے۔ تاہم اس مضمون کا بنیادی مقصد کسی کو صحیح یا غلط ثابت کرنا نہیں بلکہ بابا صاحب کے صحیح سنہِ وفات کی کھوج ہے۔ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے، ہماری رائے پر انحصار کرنے کی بجائے، ڈاکٹر منظور ممتاز کی کتاب، خصوصاً اس کے صفحات ۱۶ تا ۶۳ پڑھ کر، خود اپنی رائے قائم کریں اور حسب توفیق وہدایت تحقیق کی نئی راہوں پر [illegible] ہوں۔ اس مبارک مقصد کے لئے ڈاکٹر منظور ممتاز کی کتاب (اور دوسری کتابوں) کے ملنے کا مکمل پتہ جو کتاب پر درج تھا، اس مضمون کے متن میں، اور آخر میں کتابیات کے عنوان کے تحت دے دیا گیا ہے۔
۴	۵ محرم ۶۶۶ھ	۲۶/ستمبر ۱۲۶۷ء	پیر	اس وقت بلبن کو سلطان بنے تقریباً ڈیڑھ برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس سنہِ وصال کی تائید میں ''خزینۃ الاصفیاء'' کے دو تاریخی قطعے ہیں ورنہ سیرت یا تاریخ کی کسی مشہور کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ بابا صاحب کی تاریخ رسالِ وفات کے

۴	۵ محرم ۶۶۶ھ	۲۶ ستمبر ۱۲۶۷ء	پیر	کے مسئلے کا حل تاریخی قطعات میں نہیں، اگر ہوتا تو مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔ قطعات کی یہ شہادت غیر متعلقہ نہیں لیکن ناکافی ہے، بہر حال تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ''خزینۃ الاصفیاء'' کا مکمل پتہ، جو کتاب پر درج تھا، اس مضمون کے متن میں اور آخر میں ''کتابیات'' کے عنوان کے تحت دے دیا گیا ہے۔
۵	۵ محرم ۶۶۷ھ	۱۴ ستمبر ۱۲۶۸ء	جمعہ	اس وقت بلبن کو سلطان بنے تقریباً ڈھائی برس کا عرصہ ہو چکا تھا اس سنہ وصال کا ذکر ایک تو ''آکھیا بابا فرید نے'' نامی کتاب کے صفحہ نمبر ۲۰ پر ملتا ہے اور اسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے منسوب کیا گیا ہے اور اس نسبت کی کچھ تفصیل کتاب ہٰذا کے صفحہ نمبر ۲۶ پر دی گئی ہے جو نا قابلِ فہم ہے۔ اور دوسرے ''خزینۃ الاصفیاء'' کے صفحہ نمبر ۱۳۶ پر دو کتابوں یعنی ''مخبر الواصلین'' اور ''تذکرۃ العاشقین'' کے حوالے سے نظر آتا ہے۔ ''آکھیا بابا فرید نے'' اور ''خزینۃ الاصفیاء'' کے مکمل پتے یا مضمون کے متن اور کتابیات کے عنوان کے تحت دیئے گئے ہیں۔
۶	۵ محرم ۶۶۸ھ	۴؍ستمبر ۱۲۶۹ء	بدھ	اس وقت بلبن کو سلطان بنے تقریباً ساڑھے تین برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس محرم سے تین ماہ پہلے رمضان کا تقریباً پورا مہینہ مئی کے مہینے میں تھا جو خربوزوں کی فصل کا موسم ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے ''آئین اکبری'' اور شیخ عبدالرحمن چشتی نے ''مرآۃ الاسرار'' میں یہی بابا صاحب کا سالِ وصال بتایا ہے۔ ''مرآۃ الاسرار'' میں ۶۶۸ھ کے ساتھ ۶۶۹ھ کا بھی ذکر ہے لیکن ۶۶۹ھ کا ذکر روایت کے طور پر کیا گیا ہے، ۶۶۸ھ کا ذکر

۶	۵ محرم ۶۶۸ھ	۴ ستمبر ۱۲۶۹ء	بدھ	روایت کے حوالے سے نہیں کیا گیا۔ ''مقام گنج شکر'' تیسری کتاب ہے جس میں ۶۶۸ھ کو بابا صاحب کے سالِ وصال کے طور پر لکھا گیا ہے۔ مزید تبصرہ آگے کیا گیا ہے۔
۷	۵ محرم ۶۶۹ھ	۲۴؍اگست ۱۲۷۰ء	اتوار	اس کی کوئی روایت ہمارے نظر سے نہیں گذری۔
۸	۵ محرم ۶۷۰ھ	۱۳؍اگست ۱۲۷۱ء	جمعرات	اس وقت بلبن کو سلطان بنے پورے ساڑھے پانچ برس ہو چکے تھے۔ اگر اس تاریخ کو بلبن کے عہد سلطانی کے ''ابتدائی دور'' میں شمار کیا جاسکتا ہے، تو ''سیر الاولیاء'' کے ان دو یا تین اقتباسات کی روشنی میں، جن میں بابا صاحب کو جمادی الاولیٰ ۶۶۹ھ، شعبان ۶۶۹ھ اور رمضان ۶۶۹ھ میں زندہ بتایا گیا ہے، اس کے سنہ وصال ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر، مزید تبصرہ آگے کیا گیا ہے۔
۹	۵ محرم ۶۷۱ھ	۲؍اگست ۱۲۷۲ء	منگل	اس کی کوئی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔
۱۰	۵ محرم ۶۷۲ھ	۲۲ جولائی ۱۲۷۳ء	ہفتہ	اس کی کوئی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری۔
۱۱	۵ محرم ۶۷۳ھ	۱۱ جولائی ۱۲۷۴ء	بدھ	اس کی کوئی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری

(۲) اب ہم ایک تقابلی جائزہ پیش کرتے ہیں جس میں ''فوائد الفواد'' میں دیئے ہوئے تین اشاروں اور ''تاریخ فیروز شاہی'' کے متعلقہ اقتباس کی کسوٹی پر، ۶۶۸ھ اور ۶۷۰ھ کو جانچا گیا ہے۔

نمبر	اشارے	۶۶۸ھ	۶۷۰ھ
(۱)	باباصاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا کی وفات کے درمیان تین برس کا وقفہ	''آئینِ اکبری'' اور ''مرآۃ الاسرار'' میں، الگ الگ صفحات پر، باباصاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا کے یہ سنین وفات درج ہیں: (جدول نیچے) ۶۶۵ھ اور ۶۶۸ھ میں تین برس کا یہ وہی فرق ہے جو ''فوائد الفواد'' کے انگریزی ترجمے اور ''سیر الاولیاء'' میں درج ہے۔ اس طرح ۶۶۸ھ اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔	اگر باباصاحب کا سنۂ وصال ۶۷۰ھ ہے تو شیخ بہاء الدین زکریا کا سنۂ وصال ۶۶۷ھ ہونا چاہئے، ''۶۶۷ھ'' کا ذکر بطور سنۂ وفات شیخ بہاء الدین زکریا صرف دو جگہ نظر آتا ہے، اولاً ''بزم صوفیہ'' کے صفحہ نمبر ۱۳۰ پر جو ''سیر الاولیاء'' کے صفحہ نمبر ۹۱ کے حوالے سے دیا گیا ہے اور دوسرا سترہویں صدی عیسوی کے قطعاتِ تاریخ ہائے وفات کے شعری مجموعے ''مخبر الواصلین'' میں۔ ان دونوں پر تبصرے اوپر درج کئے جاچکے ہیں، ''سیر الاولیاء'' کا حوالہ خاصا مشکوک اور تحقیق طلب ہے
(۲)	منگولوں کا ملتان پہنچ جانا، یا ملتان پر یلغار کرنا، یا ملتان کی تسخیر	تاریخ ہند یا تاریخ ملتان کا جو موجو مواد ہماری نظر سے گزرا ہے اس سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ منگول ۶۶۸ھ / ۱۲۶۸ء میں ملتان پہنچ گئے یا انہوں نے ملتان پر یلغار کی یا ملتان کو فتح کیا۔	۶۶۸ھ والی صورتِ حال یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ تاریخ ہند یا تاریخ ملتان کا کوئی ایسا حوالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا کہ ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء میں منگولوں نے ملتان پر یلغار کی یا ملتان کو فتح کیا۔
(۳)	خربوزوں کی فصل کا موسم	۵ محرم ۶۶۸ھ سے قبل، رمضان ۶۶۷ھ کے تقریباً تمام روزے ماہ مئی میں ہوئے جو خربوزوں کی فصل کا موسم ہوتا ہے۔	۵ محرم ۶۷۰ھ سے قبل، رمضان ۶۶۹ھ کے روزے وسط اپریل اور وسط مئی کے درمیان ہوئے جو خربوزوں کا موسم ہے۔
(۴)	باباصاحب بلبن کے ابتدائی دور میں زندہ تھے۔	بلبن گیارہ جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ (مطابق اٹھارہ فروری ۱۲۶۶ء) کو سلطانِ دہلی بنا، ۵ محرم ۶۶۸ھ (۴ر ستمبر ۱۲۶۹ء) کو بلبن کو سلطانِ دہلی بنے ساڑھے تین برس سے اوپر ہوگئے تھے۔ یہ بلبن کے عہد سلطانی کا ابتدائی دور کہا جاسکتا ہے۔	۵ محرم ۶۷۰ھ (مطابق ۱۳ر اگست ۱۲۷۱ء) کو بلبن سلطان دہلی بنے ساڑھے پانچ برس ہونے والے تھے یعنی بلبن کے بیس سالہ دور سلطانی (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء) کا چوتھائی حصہ گزر چکا تھا۔

کتاب کا نام	صفحہ	شیخ بہاء الدین زکریا	صفحہ	باباصاحب
آئینِ اکبری	۳۲۸	۶۶۵ھ	۳۲۹	۶۶۸ھ
مرآۃ الاسرار	۷۰۰	۶۶۵ھ	۷۷۱	۶۶۸ھ

(۵) اگر باباصاحب کے سالِ وصال کا انتخاب ۶۶۸ھ اور ۶۷۰ھ کے مابین ہوتا ہے تو جو محققین

۶۶۸ھ کے حق میں ہیں، انہیں اولاً یہ تحقیق کرنا ہوگی کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''اخبار الاخبار'' میں باباصاحب کا سنۂ وفات کیا ہے، ثانیاً ''سیر الاولیاء'' میں جمادی الاولیٰ، شعبان اور غالباً رمضان ۶۶۹ھ کے جو واقعات درج ہیں، ان میں ۶۶۹ھ کو رد کرنے کے لئے ان کے پاس کیا دلائل و شواہد ہیں۔ جو محققین ۶۷۰ھ کے حق میں ہیں، انہیں سب سے پہلے اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ ''سیر الاولیاء'' میں ''۶۷۰ھ'' کو کہیں بھی باباصاحب کے سالِ وصال کے طور پر نہیں لکھا گیا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ باباصاحب کا سالِ وصال کیوں نہیں دیا گیا۔ ۶۷۰ھ کا بطور سنۂ وفات استخراج، جمادی الاولیٰ، شعبان اور غالباً رمضان ۶۶۹ھ میں ہونے والے واقعات کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ چوں کہ ''سیر الاولیاء'' میں درج بعض تاریخی واقعات، جو باباصاحب سے متعلق ہیں، تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتے، ''سیر الاولیاء'' کو اپنے نتائج کی بنیاد بنانے والے محققین کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلکتے اور لندن میں ''سیر الاولیاء'' کے سترہویں صدی عیسوی میں کتابت ہونے والے ان قدیم قلمی نسخوں کے ان کلیدی اقتباسات کا گہرا اور ناقدانہ مطالعہ کریں جو باباصاحب کے وصال یا ان کے سنۂ وصال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں دیکھنے والی اصل چیز یہ ہے کہ قومی عجائب خانہ کراچی کے ''سیر الاولیاء'' کے قلمی نسخے میں رمضان میں پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں جو فقرہ نامکمل طور پر ''سنہ تیین وستماۃ'' لکھا گیا ہے، اس میں لفظ ''سنہ'' اور لفظ ''و'' کے بیچ میں کیا لفظ چھٹا ہے۔ کیا یہ ''سہو'' کسی پوشیدہ چیز کو ظاہر کرنے کی جانب اشارہ ہے؟ اگر کلکتے اور لندن کے قلمی نسخوں سے جو سترہویں صدی عیسوی / گیارہویں صدی ہجری میں کتابت ہوئے، یہ آشکار ہوجائے کہ نہ صرف رمضان میں ہونے والے واقعات، بلکہ اس سے پیشتر شعبان اور جمادی الاولیٰ میں واقع ہونے والے واقعات میں بھی ''سنہ تسع وستین وست ماۃ'' کے بجائے ''سنہ سبع وستین وستماۃ'' کے الفاظ لکھے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ واقعات بھی ۶۶۹ھ کے بجائے ۶۶۷ھ میں وقوع پذیر ہوئے اور باباصاحب کا انتقال، اگلے برس ۵ محرم ۶۶۸ھ (مطابق ۴ ستمبر ۱۲۶۹ء) ہوا، بدھ کے دن۔

(۶) شیخ بہاء الدین زکریا کے نام پر آج ملتان میں ایک یونیورسٹی قائم ہے، جہاں سے ''پی، ایچ، ڈی'' کی ڈگریاں بھی دی جاتی ہیں۔ اس یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ اور فرض شناس اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اس عظیم شیخ کے سنۂ وصال کا صحیح تعین کریں جس کے نام اور دم قدم کی برکت سے ملتان کو یہ دانش گاہ

اوراس دانش گاہ میں کام کرنے والوں کو یہ مناصب ملے ہیں۔ یہ فرض ان پر ایک قرض بھی ہے جوانھیں اتارنا ہے۔

(۷) پنجاب کا محکمۂ اوقاف، پچھلے چالیس برس سے، بابا صاحب اور شیخ بہاء الدین زکریا کے مزارات سے کروڑوں روپے کما چکا ہے۔ کیا یہ محکمہ یا وفاقی یا صوبائی حکومت کا کوئی محکمہ، یونیورسٹی یا غیر سرکاری ادارہ کسی عقیدت مند، دردمند اور تعلیم یافتہ شخص کو کلکتے اور لندن بھیج کر یہ بنیادی معلومات حاصل نہیں کرسکتا؟

اس مضمون کی تیاری میں راقم کو ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کے ذاتی کتب خانوں سے استفادہ کا موقع ملا، ان حضرات نے کتابوں کی جانب نشاندہی اور رہبری بھی کی، جس کے لئے ان حضرات کا ممنون ہوں۔

فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸
معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت: دارالمصنفین، اعظم گڈھ　　پتہ: دارالمصنفین، اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت: ماہانہ　　نام پبلشر: ضیاء الدین اصلاحی
نام پرنٹر: ضیاء الدین اصلاحی　　ایڈیٹر: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت: ہندوستانی　　قومیت: ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ دارالمصنفین

میں ضیاء الدین اصلاحی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

ضیاء الدین اصلاحی

پروفیسر محمد الیاس برنی

از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ٭

(۲)

۱۹۲۷ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر اور حج و زیارت کا شرف

برنی صاحب کے مرشد شاہ محمد حسین چشتی قادری نے ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں حج کیا تو آکر انہیں بشارت دی کہ ان شاء اللہ قریب ہی آپ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ برنی صاحب نے ایک دن فرصت میں مولانا عبدالقدیر صاحب حیدرآبادی سے دوران گفتگو میز سے جنتری اٹھائی تعطیلات پر نظر پڑی تو رخصت ملاکر دیکھا اتنی مدت ہوگئی ہے سفر بخوبی کیا جاسکتا ہے [۱]

عبدالقدیر صاحب، ان کے مرید سید حبیب [۲] علی اور مخلص دوست لطف احمد [۳] بھی تیار ہوگئے۔ دو سید ایک صدیقی اور برنی فاروقی چاروں کا قافلہ تیار ہوگیا۔ امیر قافلہ برنی صاحب کو بنایا گیا چنانچہ موصوف فرماتے ہیں:

"خدا کا فضل تھا ایک جان چہار قالب تھے، یک دل و یک زبان تھے۔ چنانچہ ہمارے دوست سید امجد حسین امجد فرماتے ہیں نہ

---

[۱] مراۃ الحمید ج ۱ ص ۵۱ [۲] ایضاً ص ۳۱۱-۳۱۳ [۳] ایضاً ص ۳۱۵۔

٭ مشرف تخصص علوم حدیث، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

اک راگ بنا ہے مختلف سر مل کر تصدیق ہوئی چند تصور مل کر
برنی، حسرت، حبیب، لطف احمد اک جسم بنا ہے چار عنصر مل کر[1]

قرآن کریم کھولا یہ آیت شریفہ نکلی :

وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ٥

اس سفرنامہ کا نام "صراط الحمید" رکھا . . . . جیسی نظر ویسی دید جیسی طلب ویسی یافت ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بہر حال روحانی فیوض و برکات کی بحث بہت نازک ہے جس پر گزرے وہی جانے ؎

لذتِ مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی "

برنی اُس سفر کی مدت اور اس کی برکات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :

"یکم رمضان المبارک مطابق ۶ مارچ ۱۹۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۲۹ ذی الحجہ مطابق ۲۰ جون ۱۹۲۷ء کو گھر لوٹ آئے۔ چار ماہ میں اللہ تعالیٰ نے اتنی وسعت و برکت دی کہ عراق، شام، فلسطین اور حجاز، دور دراز ممالک کا سفر طے ہوگیا۔ بغداد شریف و ملحقاتِ شریفہ میں دو ہفتے، دمشق میں ایک ہفتہ، بیت المقدس میں ایک ہفتہ، مدینہ منورہ میں تین ہفتے، مکہ معظمہ میں دو ہفتے غرض . . . قدم قدم پر اور لمحہ لمحہ پر تائیدِ ایزدی اور لطائفِ غیبی کا جلوہ نظر آتا تھا جو چشمِ بصیرت کھولتا اور نور ایمان بڑھاتا تھا"

مدینہ میں معمولات اور حرم نبوی میں جاروب کشی

حرمِ نبویؐ میں ہر ایک کا اپنے اپنے اوقات میں اپنا اپنا معمول ہوتا ہے۔ برنی صاحب کا معمول یہ تھا :

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۶

شب کو ڈھائی کے قریب حرمِ شریف کے دروازے کھلتے ہیں حاضر رہتے۔ فرطِ شوق سے، بڑے ادب سے لمبے لمبے قدم آہستہ آہستہ رکھتے، گویا دبے پاؤں جاتے، روضۃ الجنۃ میں تلاوت کرتے، محراب النبیؐ میں نماز پڑھتے مواجہ شریف میں درود و سلام پیش کرتے، پھر وظیفہ پڑھتے، فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی تاروں کی چھاؤں میں جنت البقیع میں دوڑ جاتے، نورِ ظہور کے وقت وہاں بھی یک سوئی ہوتی، سب ہی مزارات پر بلاناغہ حاضر ہوتے، فاتحہ پڑھتے اور حضرت سیدہ خاتون جنت کے مزار پر دیر تک حاضر رہتے، مگر دل نہ بھرتا تھا طلوعِ آفتاب کے بعد حجاج کی آمد ہوتی اس وقت فاتحہ سے فارغ ہوکر حرمِ شریف واپس پہنچتے۔[1]

یہاں خدام کے ساتھ جھاڑو بہارو کے کام میں شریک ہوجاتے، ریاض الجنۃ میں فرش جھاڑتے، جھاڑو دیتے، خدام میں نام شامل کراتے، غیر حاضری پر باز پرس ہوتی تھی، کام دل کھول کر کرتے اور لطف اٹھاتے۔[2] چنانچہ فرماتے ہیں :

" اس میں ایک آدھ گھنٹہ صرف ہوتا۔ صبح ۷-۸ بجے کے قریب فراغت ہوتی تو مکان پر آتا، ناشتہ کرکے سو جاتا۔ دوپہر کو اٹھتا۔"[3]

حرمِ نبویؐ میں رات کو ٹھہرنے کے لئے خصوصی اجازت درکار ہوتی، درخواست کی منظوری منتظمین کی صواب دید پر موقوف ہوتی تھی۔ برنی صاحب اور ان کے دوستوں نے بھی اجازت مانگی تو مل گئی۔ برنی صاحب اس کی داستان یوں بیان کرتے ہیں :

"۶-۷، ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ یوم یکشنبہ و دوشنبہ کی درمیانی شب حرم شریف میں بسر ہوئی۔ اس شب کا کیا کہنا۔ زہے قسمت، زہے نصیب، عشاء کی نماز پڑھ کر

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۲۹ [3] ایضاً۔

ہم چاروں اغوات کے چبوترہ پر بیٹھ گئے، نمازی رخصت ہوئے پھر خدام رخصت ہوئے، شاید کوئی خادم اندر رہ گیا ہو مگر نظر نہیں آیا، حرم شریف کے دروازے بند ہو گئے، روشنی مدہم ہو گئی، غرض تخلیہ ہوا تو عجب شانِ جلالت کے آثار محسوس ہونے لگے، بے اختیار دل عظمت سے بیٹھا جاتا تھا، ہم چاروں اندر سے اٹھ کر باہر صحن میں آ بیٹھے، نوافل، ذکر و فکر، صلوٰۃ و سلام میں ہر کوئی اپنے اپنے ذوق کے مطابق مشغول ہو گیا، شاید نیند آئے مگر کیا ممکن ہے کہ پلک جھپکے، البتہ محویت ضرور تھی رات ڈھلی تو ۲ بجے کے قریب دلوں پر جمال چھا گیا، رؤف رحیم کا رنگ آ گیا۔ صاف معلوم ہوا کہ اب حاضر ہونا چاہئے۔[1]

الحمد للہ اس سے بڑھ کر زندگی میں کون سا وقت آسکتا ہے۔ اٹھے اور لڑکھڑاتے بارگاہِ اقدس کی طرف چلے، کسی کے دل میں تخلیہ کی تمنا تھی، خدا کی قدرت تینوں رفیق نماز کے واسطے روضۃ الجنۃ میں ٹھہر گئے اور ایک دیوانہ اپنی دھن میں افتاں و خیزاں پہنچا اور مواجہ شریف میں آستانۂ معلیٰ کی جالی مبارک پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ اکبر، وہ تنہائیِ شب کی خموشی، پیشی میں صرف دو شمعیں روشن اور بارگاہِ اقدس کی حضوری ؎

یارب کجاست محرم رازے کہ یک زماں
دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید

اتنے چاروں رفیق جمع ہو گئے اپنا اپنا ربط اپنا اپنا حال ؎

ہم ہی ہم ہیں تری محفل کوئی اور نہیں

گھنٹے منٹوں کی طرح گزر گئے وہی تین بجے حرم شریف کے دروازے کھلے اور تخلیہ برخاست ہوا اپنے حق میں یہ شب لیلۃ القدر معلوم ہوتی تھی الحمد للہ حمداً کثیراً و صلی اللہ علی رسول اللہ و بارک و سلم۔[2]

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۰-۱۸۱ [2] ایضاً ص ۱۸۱-۱۸۲۔

خصوصی صلوٰۃ و سلام کا القا: برنی صاحب فرماتے ہیں:

"مواجہ شریف میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دعائیں خدا جانے کتنی مانگیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں لیکن ایک دعا دل ہی مانگی کہ ایک ایسی درود ذہن میں آجائے جس میں حضورؐ کی وہ شان مذکور ہو جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلم ہے، وہ درود ذہنی ہو، کسی سے اب تک منقول نہ ہو، وہی پڑھا کروں اور اس کو حضور کا فیض سمجھوں، اللہ تعالیٰ کی شان مجھ جیسے کم علم کے ذہن میں بلا تفکر ایک قرآنی درود شریف معاً اتر آئی اور ہمیشہ وہی ورد ہی وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ باتباع امر اس کو یہاں ظاہر کرتا ہوں، وہ یہ ہے:

اللّٰھم صل و سلم علی سیدنا محمد طٰہٰ و یٰسین ختم ختم، خاتم النبیین رحمۃ للعالمین بالمومنین رؤف رحیم وانک لعلیٰ خلق عظیم و علیٰ آلہٖ و صحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

اس ورد سے عجیب برکات محسوس ہوتے ہیں امید ہے اس سے مومنین کو فیض پہنچے گا اور خیر جاریہ کے ثواب میں اللہ تعالیٰ ہم کو بھی شریک رکھے گا۔"[1]

مدینہ سے روانگی: برنی صاحب کے دو ہفتہ یہاں بہت راحت سے گزرے لیکن جب رخصت کا خیال آنے لگا تو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے، اس میں ہفتہ عشرہ اور گزر گیا۔ ۲۲ ذیقعدہ کو روانگی پختہ ہوئی اور احرام باندھ کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو کیفیت یکسر بدل گئی، رخصت کے وقت دل خوشی سے بھر گیا۔ معلم الوداع یا رسول اللہ پڑھواتے اور برنی صاحب فرماتے ہیں ہماری زبان سے

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۳۔

الوداع یا رسول اللہ، نکلتا تھا۔[1]

جدائی کا احساس دل سے غائب تھا، مدینہ سے مکہ معظمہ کیا جا رہے ہیں، گویا محمد رسول اللہ کے وسیلہ سے لا الٰہ الا اللہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تک یہ دعا تھی خدایا از تو می خواہم مصطفیٰ را۔ اب یہ ورد شروع ہوا۔ محمد از تو می خواہم خدا را۔

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر[2]

اولاد برنی صاحب کی تین لڑکیاں تھیں ان میں سے (۱) رشیدہ کی شادی اپنے مرشد حضرت مولانا محمد حسین کے فرزند مسعود حسن سے اور (۲) فاطمہ کی مولانا عبدالقدیر صدیقی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے فرزند موسیٰ عبدالرحمن سے اور (۳) کنیز فاطمہ کی عبدالقدیر صدیقی کے چچازاد بھائی نواب صدیق یار جنگ کے فرزند امجد اللہ صدیقی سے کی تھی۔ برنی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ تینوں صاحب اولاد ہیں، صاحب روزگار ہیں، اللہ تعالیٰ شاد و آباد رکھے۔"[3]

برنی صاحب کے والد ماجد برنی صاحب کے والد ماجد حافظ محمد ابراہیم تندرست اور صحت مند تھے، ورزش کرتے تھے، آخر عمر تک نشست و برخاست میں کوئی معذوری نہ تھی، ساٹھ سال کی عمر میں آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، علی گڑھ میں آنکھ بنوائی، اچھی بنی لیکن پھر پانی اتر آیا۔ وفات سے دو سال پہلے دہلی میں آنکھ بنوائی بالکل اچھی بنی اپنی ضرورت کے سب کام کرتے تھے، دانت آخر عمر تک مضبوط تھے، صرف آگے کا ایک دانت گرا تھا۔ حافظ تھے بہت پرہیزگار، تہجد گزار، اذکار و اوراد کے پابند بزرگ تھے۔

۱؎ صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۱-۱۸۲ ۲؎ ایضاً ص ۱۹۲-۱۹۳ ۳؎ برنی نامہ ص ۱۷۔

لڑکپن میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۳۵-۱۲۹۲) سے بیعت ہو گئے تھے، ڈھلتی رات اٹھنا اور نماز کے بعد صبح تک یاد اللہ میں مصروف رہنا معمول تھا عمر بھر میں انتقال سے پہلے رمضان کے دو روزے چھوٹے تھے۔ تاریخ اسلام، فقہ، تصوف، طب سے خاص دلچسپی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سلیس اردو میں لکھی تھی۔ شاہ ولی اللہ کی ہوامع اور محمد حقی نازلی کی "خزینۃ الاسرار" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ سب مسودات کی صورت میں محفوظ تھا۔ فن بیطاری پر ایک رسالہ لکھا تھا، طبی مجربات بھی مرتب کیے تھے[1] حیدرآباد میں بحیثیت وکیل چالیس برس بسر کیے جو لوگ واقف حال تھے کہتے تھے کہ وکالت میں ولایت کر دکھائی تھی[2] ان کے مکتوبات شائع کیے جائیں تو بہت سے جوہر کھلیں۔

برنی صاحب کا بیان ہے انتقال سے تین سال قبل حسب معمول میں موسم سرما کی تعطیلات میں حاضر خدمت تھا۔ پوچھا تمہیں کوئی استخارہ بھی معلوم ہے میں نے عرض کیا حضرت کو کئی استخارے معلوم ہیں تعمیل ارشاد میں ایک استخارہ عرض کرتا ہوں، مختصر مقبول ہے، تیسرے دن حسب معمول فجر کی نماز کے بعد سلام عرض کرنے گیا تو دیکھا کہ لحاف اوڑھے لیٹے ہیں۔ قریب بیٹھا تو محسوس ہوا کہ رقت طاری ہے، حیرت ہوئی، خاموش بیٹھا رہا، حضرت کو افاقہ ہوا تو فرمایا کہ واقعی تمہارا استخارہ بہت مقبول ہے، میں ادب سے خاموش رہا، خود دل میں لڑکپن میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کا مرید ہو گیا تھا، اس کے بعد بڑے بڑوں کی صحبت و شفقت رہی لیکن کسی سے بیعت کی نوبت نہیں آئی، اب آخر عمر میں یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ کم عمری

۱؎ صراط الحمید ج ۲ ص ۲۳-۲۴ ۲؎ ایضاً ص ۲۵۔

کی بیعت مسلم رہی یا پھر تجدید کی ضرورت ہے، تہجد میں غنودگی ہوئی تو خواجہ باقی باللہ کو متوجہ پایا، انہوں نے فرمایا تمہاری قدیم بیعت مسلم و مقبول ہے اور کل پیران سلسلہ تم پر مہربان ہیں۔[1]

وصیت نامہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء میں خط بھیجا ناسازی طبع سے آگاہ کیا اور لکھا تینوں بھائیوں میں سے جو بھی بآسانی آسکے ایک ماہ کے لئے آجائے تاکہ ضروری کام نمٹائے جائیں، عجلت کی ضرورت نہیں۔ برنی موسم سرما کی چھٹی میں آجائے تو اچھا ہے، ۱۴ دسمبر سے سرما کی چھٹی شروع ہوئی میں روانہ ہوا، جب میں بلند شہر پہنچا اولاً ملا تو طبیعت ٹھیک تھی، فرمایا تمہاری آمد کی خوشی میں سنبھل گئی، وصیت نامہ تیار تھا، ۱۷ دسمبر سہ پہر سے ملکیت و جائیداد کے کاغذات و حسابات دیکھنے اور سمجھنے شروع کر دیئے اور اگلے دن کو صبح سے شام تک یہی کام کیا، تیسرے دن ۱۹ دسمبر دوپہر تک اس کام سے فارغ ہوا، عدالت کے کارندے منشی اوصاف علی صاحب اس کام میں شریک رہے منشی جی لکھیں اگر کوئی پیچیدگی پیش آتی، حضرت اسے سلجھا دیتے تھے، اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وصیت نامہ بعد نظر ثانی مکمل ہو گیا، اس میں سب وارثوں کے نام ملکیت و جائیداد کی تقسیم درج ہوئی اور خاندانی امور کے متعلق ضروری ہدایات بھی۔ اس وصیت نامہ کے بعد خاندان میں کوئی اختلاف نمودار نہ ہو سکا اور اتفاق رہا۔[2]

حج بدل کی وصیت و تاکید ۱۸ دسمبر کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ اطمینان سے بیٹھے تو والد صاحب نے خود ہی حرمین شریفین کا ذکر چھیڑا، مجھ سے حالات سننا شروع کئے، جب مدینہ کا ذکر چلا تو طبیعت مچل گئی۔ رقت شروع ہو گئی، گھر کی بہو بیٹیاں آ بیٹھیں

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۲۵-۲۶ [2] ایضاً ص ۱۲۔

دلوں کا جوش آنکھوں سے جاری ہو گیا، یقین ہو رہا تھا کہ غلام اپنے آقا کی توجہ سے سرفراز ہوئے ہیں ؎

اثر اتنا تو ہو جذب دل ناشاد کبھی — مجھ کو بھولے سے مدینے میں کریں یاد کبھی
ہجر کی میری زبانی سنیں روداد کبھی — ہند میں کر نا مری خاک نہ برباد کبھی

حضرت نے اسی حالت میں فرمایا کہ دلوں کے حال سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے، مجھے عمر بھر حج و زیارت کی تمنا رہی اور دو ایک مرتبہ تو تہیۂ سفر بھی ہو گیا، لیکن نہ معلوم کیا مصلحت الٰہی تھی کہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور دل کی دل ہی میں رہ گئی، تم حج سے آئے میری ہمت بڑھ گئی کہ تم کو ساتھ لے کر جاؤں گا، آرام رہے گا۔

لیکن جسم میں طاقت تھی تو نگاہ بے کار تھی اب نگاہ درست ہوئی تو طاقت نے جواب دے دیا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ تم ارمان خود ہی جا کر میرا حج بدل ادا کرنا اور مدینہ حاضر ہو کر صلوٰۃ و سلام عرض کرنا۔ حرم نبوی کے خدام اور مدینہ کے حاجت مند باشندگان کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ پیش کرنا۔ اس کے لئے میں اپنے اندوختہ سے دو ہزار روپے کی وصیت کرتا ہوں۔ دو دن اور جمعہ کی رات گزری تیسرے رمضان کو صبح کے وقت وفات پائی، آپ نے بحساب سنہ عیسوی اکیانوے سال اور گیارہ یوم کی عمر پائی تھی۔[1]

حج بدل کے لئے روانگی اور حضرت گیسو دراز کے مزار پر حاضری تاریخ ۹ مارچ ۱۹۳۳ء یوم پنجشنبہ شام کو پانچ بجے حیدرآباد سے رات بارہ بجے گلبرگہ پہنچے اور حضرت خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز کے آستانہ معلیٰ پر فاتحہ پڑھی پھر رخصت ہوئے۔

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۱۸۔

برنی صاحب فرماتے ہیں:

"اول تو حضرت ماشاء اللہ ساداتِ دکن ٹھہرے، دوسرے خدا کے فضل سے اپنا چشتیہ سلسلہ راست حضرت ہی کا سلسلہ ہے، اس نسبت سے محمدی کہلاتے ہیں یہاں ہمارے سوا راست محمدی سلسلہ کم نظر آتا ہے"[1]

بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے تو بلین نمبر پانچ میں جگہ ملی، ان کی برتھ کے مقابل برتھ پر ایک قدیم دوست کا بستر جما۔ بیس برس کے بعد بغیر توقع جو یکایک ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چند سیکنڈ پہچاننے میں لگے، اس کے بعد جو گلے لگے تو کئی منٹ بغل گیر رہے ؎

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

ہم نے ایک ہی سال میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا، ایک ہی سال علی گڑھ میں داخل ہوئے، دونوں ہونہار سمجھے جاتے تھے، فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ان کو بہلا پھسلا کر ریاضی و سائنس میں کھینچا، ہم فنون میں جمے رہے، انہوں نے بی ایس سی کیا، ہم نے اکنامکس میں ایم اے کیا، ایل ایل بی کی سند دونوں نے حاصل کی، ان کا وطن مظفر نگر، ہمارا بلند شہر، کالج میں یہ کچی بارک میں، ہم پکی بارک میں رہتے تھے، یہ نماز کے مانیٹر اور ہم طعام کے مانیٹر تھے، سوٹ بوٹ سے دونوں الگ تھے۔ کالج کی رعایت سے یہ داڑھی کی تواضع کرتے تھے، ہم اس سے بھی بے فکر تھے، اب ان کی یک مشت میں دو انگشت کی کسر ہے اور اپنی رہی خشخشی، اب یہ خاصے مولوی نظر آتے ہیں، بفضلہ عنقریب حاجی بھی ہو جائیں گے، یہ نماز کے شروع ہی سے پابند

---

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۴۱۔

تھے، اب ماشاء اللہ ذکر اذکار ہیں، اشغال بھی مراقبے بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید ہیں۔

ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کہ حضرت الحاج مولانا منفعت علی صاحب انگریزی تعلیم یافتہ جماعت میں بڑے بزرگ شمار ہوں گے۔ اپنا تو وہی حال ہے ؎

گزری جہاں کے باغ میں یکساں برنگ سرو — سوکھے کبھی خزاں میں نہ پھولے بہار میں

وہی طرز، وہی روش، وہی وضع قطع، ہم نے ایل ایل بی کرتے وقت سوچ لیا تھا کہ "داشتہ آید بکار"، البتہ منفعت علی نے اس سند سے خوب کام لیا۔ سہارنپور میں چوٹی کے وکیل ہیں، ہم تعلیم و تصنیف میں مصروف ہیں"[1]

مقاماتِ زیارت | برنی صاحب فرصت کے اوقات میں آثارِ قدیمہ کی زیارت کے لئے بھی جاتے تھے، جو سعودی حکومت نے اب ڈھا دئے تھے۔ جیسے مولد النبیؐ، مولد فاطمہؓ، مولد علیؓ۔ چنانچہ برنی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ تینوں مقام اب ویران چٹیل میدان پڑے ہیں، لوگ پتہ بتاتے ڈرتے ہیں کوئی نہ بتائے تو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں دنیا کی بہترین مرصع اور متبرک عمارت کھڑی تھیں، ظاہر و باطن کی نعمتوں سے مالا مال تھیں، ان کی زیارات سے آنکھوں میں نور، دل میں سرور آتا تھا، اب وہ سب خواب و خیال ہو گیا، البتہ جو حقیقی برکات ہیں وہ حق داروں کے واسطے دائم قائم ہیں"[2]

غسلِ کعبہ کا معطر زمزم کا گلاس | برنی صاحب معلم کے چھوٹے بھائی حسین صاحب کے ساتھ ۱۳ ذی الحجہ یوم پنجشنبہ صبح کے وقت شیبی صاحب سے ملاقات کی غرض سے نکلے،

---

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۸۰

جاتے وقت حرم شریف سے گزرے تو حسین نے کہا آج بیت اللہ شریف کو غسل دیا گیا ہے۔ ان کا مکان اس کی خوشبو سے معطر تھا۔ جب برنی صاحب پہنچے تو شیبی جلالۃ الملک سے ملنے گئے تھے، ذرا سی دیر بیٹھے تو حسین نے شیبی کے صاحبزادے سے پانی مانگا، اس نے ٹھنڈا زمزم پیش کیا، برنی صاحب فرماتے ہیں:

"مجھ سے دریافت کیا گیا میں کیوں انکار کرتا، لیکن زہے قسمت ہم کو بلا طلب اور بلا توقع غسل کا معطر زمزم ایک بڑا گلاس بھر کر عطا ہوا، عطیہ الٰہی تھا، فوراً ادب سے پی لیا۔ خوشبو سے دماغ بس گیا، خوشی سے دل بھر گیا۔ سچ پوچھئے تو روح مست ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

حسین نے مبارک باد دی کہ ایسا تبرک بن مانگے قسمت والوں کو ملتا ہے، تیری نیک فالی ہے، شیبی صاحب کا تھوڑا انتظار کیا، اس کے بعد رخصت ہوئے اور جہاں کہیں جانا تھا گئے، سب نے سُن کر مبارک باد دی اور بتایا کہ احرام میں معطر زمزم پی لیا تو دم واجب ہے، ہم نے عرض کیا ہمیں تو وہم و گمان بھی نہ تھا لیکن ؎

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے

دو دم بسر و چشم حاضر ہیں، سچ پوچھئے تو ایسا تبرک سو دم میں بھی سستا ہے[1]"

بیت اللہ میں ایک گھنٹہ

۵ ذی الحجہ کو فجر کی نماز کے بعد ہر شخص کو بیت اللہ میں داخلہ کی عام اجازت دی جاتی تھی، اس میں برنی صاحب بھی اندر گئے تھے، اس میں بھیڑ بہت ہوتی تھی اس لئے زیادہ دلجمعی سے قیام اور دعا کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔

۱؎ صراط الحمید ج ۲ ص ۸۵ و ۸۶

دوسرا شیبی صاحب کو نذرانہ پیش کرنے پر خصوصی اجازت سے داخلہ ملتا تھا۔ اس میں یکسوئی ہوتی تھی۔ برنی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کا بیان ہے:

"ہم نے بھی نذر پیش کی صرف چند حجاج کا داخلہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹہ اندر حاضری رہی، جو پڑھنا تھا پڑھا، جو کہنا تھا کہا، جو دیکھنا تھا دیکھا، اللہ اکبر! اس عالم شہادت میں اس سے بڑھ کر کیا رسائی ہوگی، بیت اللہ شریف کے اندر حاضر ہیں، عالم باطن خدا یہ روشن ہے کیا خوب ہو کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوں، اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں داخل ہو، ہمارا دل پھر بیت اللہ بن جائے ظاہر کے بیت اللہ میں باطن کا بیت اللہ آجائے، ایک حرم میں دوسرا حرم سما جائے۔

کچھ عجب لطف ہو جائے ع

اور در من و من درو چوں گلاب اندر

جن کے دل بیت اللہ تھے، ان ہی کے ہاتھوں نے اس بیت اللہ کی بنا ڈالی اور انہی کی دعاؤں سے یہ بیت اللہ آباد ہے، سبحان اللہ وبحمدہ[1]"

مکہ معظمہ کے دو تبرک

برنی صاحب کو قدیم آثار اور مقدس مقامات کی تصویروں کی جستجو تھی، مختلف دکانوں میں دیکھا، لیکن ذخیرہ مختصر تھا کوشش سے ایک غیر معروف قدیم ترکی کمپنی کے فوٹوگرافر کی دکان پر کافی تعداد میں ذخیرہ ملا، ان میں بعض نادر تصویریں مل گئیں، اس طرح بہت مسلسل اور مکمل البم مرتب ہوگیا۔ دوستوں کے واسطے متفرق فوٹو بچ رہے[2]

مکہ معظمہ کے تبرکات! دو تبرک اہم ہیں، ایک زمزم اور دوسرے غلاف کعبہ،

۱؎ صراط الحمید ج ۲ ص ۸۷ ۲؎ ایضاً ص ۸۹۔

زمزم ہر وقت ملتا ہے، غلاف کعبہ عشرہ ذی الحجہ کو نیا غلاف چڑھتا اور پرانا اتر کر تبرک
بن جاتا ہے، بکتا تھا، امسال یہ ارزاں تھا، پورا کلمہ شریف چار پانچ روپیہ میں ملتا تھا،
ہم نے دس بارہ خریدے، ان میں ایک بہت عمدہ تھا، بالکل نیا معلوم ہوتا تھا، ایک
دکان سے اکٹھے خریدے، رعایت بھی رہی [1]

قصر شاہی میں دعوت برنی صاحب آثار قدیمہ کی تصویروں کی جستجو میں ایک
دکان میں تھے کہ دو ہرکارے ان کے نام لفافہ لائے اور بولے کہ ہم آپ کو تلاش کر رہے
ہیں، یہ دعوت نامہ لیجئے اور قصر شاہی میں آج شام تشریف لائیے، ڈاکٹر خواجہ
معین الدین صاحب آپ کے انتظار میں ہیں، شرکت کا ارادہ نہ تھا، لیکن ڈاکٹر خواجہ
کو انتظار تھا، ان کے پاس پہنچے تو کہا، دونوں ساتھ چلیں گے ان کے اصرار پر قصر شاہی
پہنچے، اسلامی ملک کے معزز مہمان بیٹھے تھے۔ مجمع دیکھ کر جی خوش ہوا۔ جلالۃ الملک تشریف
لائے۔ مغربیوں کا لباس بہت خوب تھا، بعض احرام میں تھے قیمتی تولئے زیب تن کئے
تھے، بس ہماری حالت قابل دید تھی، معمولی چادروں کا احرام اور وہ میلا سلا، بال پراگندہ
گرد آلود، جیسے کوئی دیوانہ، حج کا رنگ خوب چڑھا ہوا، امیروں میں ایک فقیر بھی
موجود تھا [2]

جلالۃ الملک کے آنے پر قصیدہ خوانی ہوئی، توحید پر تقریریں سن کر تحریک ہوئی
کہ ہم بھی تقریر کرتے لیکن عربی پر ایسی قدرت نہ تھی کہ آخر میں جلالۃ الملک نے کہا کہ اگر
کوئی حاجی اپنی زبان میں تقریر کرنا چاہے تو اس کا عربی میں ترجمہ کیا جائے گا، میں کھڑا ہوا
میں نے کہا توحید کا دہرانا چنداں کارگر نہیں، رسالت کے اعلان اور وضاحت کی ضرورت

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۹۱ ۔

ہے اس کے بعد اس ایمانی توحید کا دہرانا ہے جو رسالت کے طفیل حاصل ہوتی ہے
اور جو اسلام کے باہر میسر نہیں آسکتی وہی مطلوب ہے، رسالت میں ہر کوئی سنت
پر زور دیتا ہے اور زور دینا بجا ہے اس لئے کہ قرآن میں اتباع کی تاکید ہے، لیکن
بہت سے اس راز سے بے خبر ہیں کہ محبت اور تعظیم اتباع کی جان ہیں انہی دونوں
کے صحیح امتزاج سے حقیقی اتباع پیدا ہوتی ہے، محبت میں قوت ہے اور تعظیم میں اعتدال
جس اتباع کی بنیاد محبت اور تعظیم پر نہ ہو وہ محض ایک رسمی تقلید ہے۔ اتباع نہیں
ہے اور نہ اتباع کی خیر و برکت ہے، اتباع کے واسطے محبت و تعظیم کس درجہ لازم ہے،
اہل علم اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں توحید کے پہلو
بہ پہلو حضور رحمۃ للعالمین کی محبت و تعظیم کی جو تعلیم ہے وہ دنیا میں بے نظیر
ہے کہ عبدیت میں انتہائی محبوبیت و رفعت موجود ہے [1]

اس شاہی دعوت میں مغرب کے پیر طریقت سید عبدالحی کتانی اور ملا شود
بازار بھی شریک تھے، کتانی اپنے اثر و اقتدار میں حضرت شیخ سنوسی کے ہم پلہ جانے
جاتے تھے۔ [2]

دوسرے دن ایک عرب نے موصوف کا تعارفی کارڈ دیا کہ حضرت کو ملاقات
کا اشتیاق ہے، چنانچہ بعد مغرب حرم میں شیخ سے نیاز حاصل ہوا، گلے لگایا، بہت
دعائیں دیں، اور گرد عربوں کا مجمع تھا، حضرت کے ساتھ ترجمان بھی تھا، میرے
ساتھ عبدالرحمن تھے۔ فرمایا تمہاری تقریر موثر اور بہت مقبول تھی، اسلامی جذبات
کے اظہار میں تم نے تمام اسلامی ممالک کی طرف سے وکالت و نیابت کی، یہ اللہ کا

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۸ ۔

بڑا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے، میں نے عرض کیا حضرت تقریر اردو میں تھی، اس کا عربی میں ترجمہ بھی نہیں ہوا، پھر عربوں پر اس کا اثر کس طرح ہوا۔ فرمایا ایمان و اخلاص میں بھی اثر ہے، تمہاری آواز لب ولہجہ سے حقانیت ٹپکتی تھی، دل لذت اندوز ہوئے تھے اور تم نے درمیان درمیان میں جو آیات پڑھیں، ان آیات نے عربوں پر مقصد خوب واضح کر دیا، جلسہ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مست ہوگیا، یہ بیان اختیاری نہیں، فضل الٰہی ہے [۱]۔

برنی صاحب کا مسلک و مشرب | برنی صاحب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، وہ باقاعدہ عالم نہ تھے، نہ دیوبندی علمار سے پڑھا تھا، نہ بریلوی علمار کے مدرسہ کے فاضل تھے، مگر انہ دین دار تھا، اس میں میلاد ہوتا تھا، جو اس زمانہ میں صوفیانہ مشرب بزرگوں میں رائج تھا۔ ان کی والدہ نذر و نیاز (بزرگوں کی روحوں کو ایصال ثواب کے لئے خیرات) بہت احتیاط و اہتمام سے کرتی تھیں [۲]۔

برنی صاحب صوفی مشرب تھے اور صوفیہ سے ان کا تعلق ہر زمانہ میں برابر قائم رہا ہے اس لئے وہ برزنجی اور قصیدہ بردہ پڑھتے تھے۔ سیرت اور میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جاتے، بہت عمدہ اردو و دار تقریر کرتے تھے، اس میں دانشور، محققین، تعلیم یافتہ اور اہل علم بکثرت آتے تھے، نیز حیدرآباد کے فرمانروا عثمان علی خاں بھی شرکت کرتے تھے "قادیانی مذہب" اسی جلسہ کا منظر اور ثمرہ ہے۔

بایں ہمہ وہ ایک منصف مزاج شخص تھے، اس لئے علمائے دیوبند سے ان کو کد اور نفرت نہ تھی، بلکہ ان کی کتابیں پڑھتے، ان سے استفادہ کرتے اور ان کی خوبیوں کا

---

[۱] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۸-۹۹ [۲] ایضاً ج ۱ ص ۳۱۹۔

اعتراف کرتے، انہیں حضرت گنگوہیؒ کو "رحمۃ اللہ علیہ" لکھنے میں تکلف نہ ہوتا چنانچہ حج بدل کی بحث میں لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا عبدالرشید [۱] (رشید احمد) گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس (حج بدل کے) مسئلہ کو اپنی تالیف "زبدۃ المناسک" میں بہت وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا ہے، یہ تالیف دیکھنے کو تو مختصر سی ہے لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، اس سے مولانا کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے" [۲]۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"زبدۃ المناسک دیکھنے میں گو ایک چھوٹی سی اردو کتاب ہے، حضرت مولانا حاجی رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مسائل حج اس خوبی سے یکجا کر دئے کہ دریا کوزہ میں بند نظر آتا ہے، غور کیجئے تو اجمال میں تفصیل موجود ہے۔

اس سے حضرت کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، ایک علمی کرامت نظر آتی ہے۔ حجاج کے لئے یہ کتاب بڑی نعمت ہے، مولوی یحییٰ صاحب تاجر کتب گنگوہ شریف سہارنپور نے اس کو شائع کیا ہے" [۳]۔

وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی کتاب قصیدہ بردہ کی شرح عطر الوردہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"قصیدہ بردہ کی اردو میں کئی شرحیں موجود ہیں، ایک شرح عطر الوردہ کے نام سے، مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی ہے، خوب ہے" [۴]۔

---

[۱] مطبوعہ نسخہ میں عبدالرشید چھپا ہے، یہ موصوف کی لغزش قلم ہے [۲] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۸ [۳] صراط الحمید ج ۱ ص ۲۰۴ [۴] ایضاً ص ۱۸۳۔

حضرت مولانا شفیع الدین مہاجر مکی جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ ومجاز تھے اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ان کے مرید و خلیفہ تھے، مناسک حج کے ماہر تھے، برنی صاحب نے مدینہ منورہ کی آمد و رفت کے متعلق احرام کے مسائل ان سے پوچھ کر زینت کتاب کئے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا شفیع الدین نگینہ والے مدت دراز سے بحیثیت مہاجر مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، حضرت کے علم و فضل کا کیا کہنا سبحان اللہ! خاص کر مناسک حج پر ایسا عبور بہت نادر ہے، اسی لئے حضرت سند مانے جاتے ہیں، دوسرے حج میں تحقیق مناسک (میں) حضرت سے نیاز حاصل ہوا، اس ناچیز کے حال پر بہت عنایت و شفقت مبذول رہی، چنانچہ مدینہ منورہ کی آمد و رفت کے متعلق احرام کے مندرجہ بالا مسائل حضرت کا عطیہ ہیں جو بطور خیر جاریہ درج کئے گئے ہیں۔"[1]

برنی صاحب نے علمائے دیوبند کی تعلیمی خدمات کا اعتراف مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علمائے دیوبند میں اشاعت تعلیم کا جو حوصلہ اور سلیقہ ہے، اس کی مثال ہندوستان کے دیگر علماء میں کم نظر آتی ہے، البتہ عقائد کی بحث جدا ہے، یہ ایک قدیم بحث ہے نئی نہیں۔"[2]

برنی صاحب کو مولانا مناظر احسن گیلانی (المتوفی ۱۹۵۶ء) سے جاننے والا کون ہوگا، دونوں جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر تھے، دوست تھے، ایک پیر کے مرید و خلیفہ تھے، وہ برنی صاحب کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر الیاس برنی میرے ہم مشرب دوست ہیں۔"[3]

(باقی)

---

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۲۵۳ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۸ [3] مکاتیب مناظر احسن گیلانی، مرتبہ مفتی اللہ رحمانی، مونگیر دارالاشاعت رحمانی۔ ۱۹۷۳ء۔ ج ۱ ص ۱۰۳۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

اور ٹیپو شہیدؒ

از جناب شمیم طارق صاحب*

اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلم معاشرہ کے استحکام میں جن قوتوں کو کلیدی حیثیت یا مرکزیت حاصل ہے، ان میں اہم ترین قوتیں تین ہیں:

۱۔ **علمی قوت**: جو علمائے حق کی تلاش و جستجو، عقیدہ و عمل اور دعوت و عزیمت کی رہین منت ہے۔

۲۔ **روحانی قوت**: جو سالکان راہ نبوتؐ کے دم قدم سے وابستہ ہے۔

۳۔ **دفاعی قوت**: جو سلاطین و امراء کی خدا پرستی و خدا ترسی، قبول حق کی استطاعت اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں دین فطرت کی ہمہ گیر تعلیمات کے نفاذ کی قدرت و کوشش سے متعلق ہے۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب کبھی اس تینوں قوتوں میں سے کسی ایک میں بھی کوئی خرابی پیدا ہوئی یا ان کے باہمی ربط و تعلق میں فرق پیدا ہوا ہے تو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں فساد و زوال کی کیفیت پیدا ہوئی ہے اور اس زوال و فساد کے سدباب کے لئے جو برگزیدہ

---

* ریسرچ آفیسر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

شخصیتیں کوہ استقامت بن کر سامنے آئی ہیں وہ تمام شخصیتیں مثلاً جگر گوشۂ رسولؐ شہید اعظم سیدنا امام حسینؓ، امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ بن حنبل، امام غزالیؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ امام انقلاب شاہ ولی اللہؒ وغیرہ روحانی اور علمی دونوں قوتوں کی حامل رہی ہیں اور ان تمام برگزیدہ شخصیتوں نے ظالم اور گمراہ حکمرانوں کے خلاف جہاد کر کے یا دفاعی قوت کو راہ راست پر لانے کی کوششوں کے ساتھ علمی اور روحانی قوتوں کو بھی اپنے حقیقی منصب سے نیچے گرنے یا بے لگام ہونے سے بچایا ہے۔

اکبر کے دور کے ہندوستان میں جب دفاعی قوت اسلام کی پامالی کا نشان اور کفر کی پاسبان و نگہبان بن گئی تھی۔ علمائے سو تن آسانی و شکم پروری کو اپنا مقصد حیات سمجھنے لگے تھے اور روحانی قوت کے علم بردار صوفیہ اپنا اور دوسروں کا تزکیہ نفس کرنے کے بجائے خود نفس پرستی کے موذی مرض میں مبتلا تھے، اس دور میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت اور تحریک دعوت و عزیمت نے پہلے تو علمی، روحانی اور دفاعی یعنی بیک وقت تینوں قوتوں کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بتایا کہ علماء، صوفیہ اور بادشاہ وقت اور اس کے امراء ذلت و گمراہی کے کتنے گہرے غار میں گر چکے ہیں۔

(الف) "بعض نیم ملاؤں نے طمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو ان کے خبث باطن کے سبب ہے امراء و سلاطین کا تقرب حاصل کر لیا ہے اور ان سب نے جی حضور بن کر دین متین میں شکوک و شبہات پیدا کر دئے ہیں اور اس طرح سادہ لوح حضرات کو گمراہ کر رہے ہیں"۔[1]

(ب) "جس طرح لوگوں کی نجات علماء کے وجود سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ان کی

۱؎ مکتوبات امام ربانی۔ دفتر دوم، مکتوب ۶۔

بربادی کا سبب بھی یہی علماء ہیں۔ علماء بہترین مخلوق بھی ہیں اور بدترین مخلوق بھی۔ لوگوں کا ہدایت یا گمراہی کی طرف گامزن ہونا بھی علماء ہی کے وجود سے وابستہ ہے۔

کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو اضلال و تضلیل کے کاموں سے فارغ بیٹھا دیکھا اور اس فراغت کا راز معلوم کیا تو ابلیس نے جواب دیا کہ میری جگہ اس وقت کے علماء میرا کام کر رہے ہیں۔ پس گمراہ کرنے کے لئے وہ کافی ہیں"۔[1]

علماء کا یہ حال تھا تو صوفیہ کیوں پیچھے رہتے؟ انہوں نے کشف و کرامت کے جھوٹے دعووں سے مزید غضب ڈھائے اور عوام و خواص میں یہ فاسد گمان پھیلانا شروع کر دیا کہ چونکہ انہیں معرفت حاصل ہو چکی ہے اس لئے اب وہ احکام شریعت کے مکلف نہیں رہے۔ شیخ بدیع الدینؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں حضرت امام ربانیؒ نے ان ملحدوں کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"... اکثر خام صوفی اور بے سروسامان اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ اپنی گردنوں کو شریعت مطہرہ کی اطاعت سے باہر نکال لیں اور شرعی احکام کو عوام الناس ہی کے ساتھ مخصوص رکھیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ خواص صرف معرفت ہی کے مکلف ہیں جیسا کہ وہ اپنی جہالت کے باعث امیروں اور بادشاہوں کو عدل و انصاف کے سوا کسی اور چیز کا مکلف قرار نہیں دیتے اور وہ کہتے ہیں کہ احکام شرعیہ بجا لانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ معرفت حاصل ہو جائے اور جب معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو شرعی تکلیفات ساقط ہو جاتی ہیں"۔[2]

یہی نہیں دور اکبری میں بعض ایسے افراد بھی پیدا ہو گئے تھے جو خود کو صوفی کہتے تھے

۱؎ مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب ۵۳ ۲؎ ۱۵ ایضاً۔

مگر اس وحی الٰہی کی پیروی سے علی الاعلان انکار کرتے تھے جس پر بندوں کی ہدایت کا دارو مدار ہے۔ ان "منکرین نبوت"، صوفیہ کا جو اہل ہنود کے عقیدے کی طرح اوتار ہونے کے مدعی تھے، امام ربانی مجدد الف ثانی نے سید مرتضیٰ بخاری کے نام ایک مکتوب میں یوں ذکر کیا ہے:

"اگرچہ یہ منکرین نبوت بھی خدا کو ایک کہتے ہیں، لیکن ان کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو اہل اسلام کی تقلید میں وہ ایسا کہتے ہیں یا واجب الوجود ہونے میں تو اسی ایک ذات کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن استحقاق عبادت میں اسے وحدہٗ لاشریک نہیں مانتے جب کہ اہل اسلام کے نزدیک وجوب وجود اور استحقاق عبادت دونوں امور میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ کلمۂ طیبہ لاالٰہ الا اللہ سے باطل معبودوں کی عبادت کی نفی اور حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کی معبودیت کا اثبات ہوتا ہے۔ دوسری بات جو ان بزرگوں (انبیائے کرام) کے ساتھ خاص ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات دوسرے لوگوں کی طرح خود کو بشر ہی کہتے ہیں اور الٰہ اور معبود، حق سبحانہٗ تعالیٰ کی ذات ہی کو قرار دیتے ہیں اور سب کو اسی ذات کے آگے جھکنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کی ذات کو حلول و اتحاد سے منزہ مانتے اور منواتے ہیں۔

لیکن منکرین نبوت کی یہ حالت نہیں ہے کیونکہ ان کے سرداروں نے تو الوہیت کا دعویٰ کیا ہے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کا اپنے اندر حلول بتاتے ہیں اور استحقاق عبادت اور الوہیت کا اپنے لئے کھل کر دعویٰ کرنے سے بچتے ہیں تو یقیناً انہوں نے خدا کی بندگی سے قدم باہر نکال لئے ہیں اور افعال قبیحہ و اعمال شنیعہ میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس طرح ان پر اباحت اشیا کا راستہ کھل جاتا ہے اور بزعم خویش

خدائی منصب پر فائز ہو کر وہ گمان کئے ہوئے ہیں کہ ان کے لئے کوئی چیز ممنوع نہیں ہے اور جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا ہے وہ درست ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ٹھیک ہے، مباح ہے۔ تو اس طرح وہ خود بھی گم کردہ منزل ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ تف ہے ان پر اور ان کے متبعین پر.... منکرین کے سردار اور رئیس جو خدائی کا دعویٰ کئے ہوئے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں، اپنے پاس سے کہتے ہیں اور محض اپنے باطل زعم الوہیت کی بنا پر اسے درست قرار دیتے ہیں۔ تو انصاف سے کام لینا چاہئے۔ جو شخص کمال بے عقلی کے باعث اپنے آپ کو الٰہ سمجھے اور عبادت کا مستحق جانے اور اس فاسد گمان کے تحت ناشائستہ افعال کا مرتکب ہو، اس کی باتوں کا کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے اور اس کی پیروی میں کون سی بھلائی مل سکتی ہے۔[1]

علمی اور روحانی قوتوں کے گمراہ ہو جانے کے جو اثرات دفاعی قوت پر پڑ سکتے تھے، وہ بھی پڑے اور بالآخر اکبر جو بقول ملا عبدالقادر بدایونی بذات خود ایک نفیس جوہر اور حق کا طالب تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی نرا جاہل بھی[2] وہ متکلم پرور علما اور نفس پرور صوفیہ کے اس بہکاوے میں آگیا کہ:

(الف) "عقل مند لوگ تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں اور ریاضتیں کرنے والے اور صاحبان کشف و کرامات بھی سب گروہوں میں موجود ہیں اور حقانیت سب میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے حق و صداقت کو ایک ہی دین اور ایک ہی ملت میں کیوں منحصر کیا جائے اور وہ بھی اس مذہب میں جو بالکل نیا ہے اور جس کی عمر پوری ایک ہزار سال بھی نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک کا اثبات کیا جائے اور دوسرے کی نفی۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب ۶۳ [2] منتخب التواریخ، ص ۲۵۵۔

یہ ترجیح بلا مرجح کیوں"۔ [1]

اور پھر اس کے بعد:

(ب) "جب اس (بادشاہ) نے بزعم خویش یہ خیال کر لیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کو ہزار سال گزر گئے ہیں جو بقائے اسلام کی موت تھی تو یہ دین بھی ختم ہو گیا ہے اور ان کے سامنے اب اپنے دل میں چھپے ہوئے ارادے کو ظاہر کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی، کیونکہ ان علماء و مشائخ سے بساط علم بھی خالی ہو چکی تھی جن کا اثر و رسوخ تھا۔

ایسے افراد سے میدان خالی دیکھ کر بادشاہ خوب کھل کھیلا۔ اسلامی احکام و ارکان کا بطلان کیا۔ مہمل اور بے ہودہ قوانین ایسے جاری کئے کہ عقائد و نظریات کے فساد کا بازار خوب گرم ہو گیا"۔ [2]

امام ربانی پیر طریقت تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے ۹ لاکھ مرید اور پانچ لاکھ خلفاء تھے، وہ چاہتے تو اپنی خانقاہ میں اوراد و وظائف اور تلقین و ارشاد میں مصروف رہتے، دنیا ان کے پاؤں چومتی۔ شاہی عتاب نازل ہوتا نہ گوالیار کے قلعے کی تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کئے جاتے لیکن قدرت نے تو انہیں "منصب قیومیت" پر فائز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لہذا انہوں نے جہاد و اجتہاد کی راہ کی مشکلات کو اپنا مقدر بنا لیا اور علماء، صوفیہ، امراء اور بادشاہ وقت کی گمراہیوں کی نشاندہی کے بعد ان سب کے خلاف جہاد شروع کیا۔

آپ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ہزارے یا الف ثانی میں لاثانی مجاہد و مجتہد بن کر سامنے آئے اور مذہب کی حرکیت اور تصوف کی باطنی قوت کو دوبارہ

[1] منتخب التواریخ ص ۲۵۶ ج ۲ [2] ایضاً ص ۲۰۱۔

مجتمع کر کے مسلمانوں کے عقیدہ و عمل میں در آنے والی بہت سی ناہمواریوں کو دور کیا۔ اکبر کی جاری کی ہوئی گمراہیوں کے سیلاب کا رخ پھر گیا اور آپ نے ابتلاء و آزمائش کے بعد اپنی زندگی ہی میں اپنی دعوت و تحریک کی کامیابی ملاحظہ کی۔ جہانگیر نے اکبر کے ملحدانہ احکام منسوخ کر کے اسلامی احکام نافذ کئے اور بالآخر وہی تخت شاہی جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش اور قہر بنا ہوا تھا، آئندہ ان سعادت مند روحوں کا مسکن بن گیا جو اسلام سے مکمل وابستگی پر فخر کرنے والے تھے [1]۔

یہ امام ربانی کی ہمت مردانہ اور جذب قلندرانہ کی کرامت نہیں تو کیا ہے کہ دفاعی قوت جو ان کے بقول روح کی مانند ہے اور جس کا راہ راست پر رہنا تمام رعایا کے راہ راست پر رہنے کے مترادف ہے۔ نہ صرف صراط مستقیم سے رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوئی بلکہ اس کی بگاڑی ہوئی روحانی اور علمی قوتوں کے علم برداروں میں بھی توبہ کی تحریک پیدا ہوئی۔

اس کرامت کا نقطہ عروج اورنگ زیب عالم گیر تھے۔ شیخ محمد اکرام نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ تقریباً وہ تمام اقدامات جو اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی سے متعلق تھے حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں ان سب اقدامات کی پرزور تبلیغ و تلقین فرمائی تھی"۔ [2]

[1] اشتیاق حسین قریشی اپنی تصنیف History of the freedom movement جلد اول میں رقمطراز ہیں کہ "آپ کی مسلسل کوششوں سے تحریک احیائے دین کا آغاز ہوا، چنانچہ اس انقلاب و تبدیلی کے نتیجہ میں سیاسی سطح پر جو کوششیں کی گئیں وہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگزیب عالمگیر کے درباروں کی بدلتی فضا میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں"۔ [2] Mohd IKram: History of Muslim Civilisation in India & Pakistan P - 271

لیکن یہاں ان حقائق کا اظہار اور ان پر اصرار بہت ضروری ہے کہ

"حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی نگارشات و تعلیمات اور دعوت و تحریک کے ہمہ گیر اثرات جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب یا ان کے عہد کے علماء، صوفیہ اور امراء تک محدود نہیں رہے بلکہ آنے والی چار صدیوں میں پیدا ہونے والے امراء، علماء اور صوفیہ بھی ان سے متاثر ہوئے نیز

آپ کی دعوت و تحریک کے عالمگیر اثرات افغانستان، وسط ایشیا، سلطنت عثمانیہ اور مشرق میں ملیشیا اور انڈونیشیا تک پھیل گئے"۔[1]

ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد جس شخص یا حکمراں پر حضرت امام ربانی کی تعلیمات و نگارشات کے سب سے زیادہ اثرات مرتب ہوئے، وہ سلطان جمہور ٹیپو شہیدؒ ہیں۔ Wellesley Papers سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ احیائے اسلام کے حامیوں میں تھے اور اکثر امام ربانی کے مکتوبات و نگارشات کے حوالے دیا کرتے تھے لیکن حیرت ہے کہ کسی ہندوستانی دانشور، مورخ یا عالم نے اس تعلق پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

اقبال جو "امام ربانی" کو ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان سمجھتے تھے اور جنھیں اللہ نے بروقت خبردار کیا تھا"۔ البتہ اورنگ زیب اور ٹیپو شہیدؒ دونوں کے مداح تھے لیکن چونکہ خود فکر اقبال پر تعلیمات مجددیہ کے اثرات کا ابھی کماحقہٗ جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے اس لئے ان کی ان "عبقری اور اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کو اپنے کردار و عمل میں ڈھال لینے کی کوشش کرنے والے حکمرانوں سے قلبی، روحانی وابستگی کو بھی نہیں سمجھا جا سکا ہے۔ علامہ اقبال جنھوں نے

---

[1] Dr. Ishtiaque Quraishi — Muslim Community of India Pakistam . Page 152 .

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے فقر و استغنا اور شجاعت و حق پرستی سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے یہاں تک کہا ہے کہ

حق گزید از ہند عالمگیر را　　آں فقیر صاحب شمشیر را

اور جنھوں نے ٹیپو شہیدؒ کے جاہ و جلال اور ان کی تبر پر طاری ہونے والی کیفیت پر یہ کہہ کر قلب و نگاہ نثار کئے ہیں کہ

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر　　خاک قبرش از من و تو زندہ تر

ان دونوں شخصیتوں میں تعلیمات مجددیہ ہی کے عکس دیکھتے تھے اور اس لئے ان کے مداح تھے اور ان کے ذکر سے قلبی سکون محسوس کرتے تھے۔

اورنگ زیب پر تعلیمات مجددیہ اور خانوادۂ امام ربانی کے اثرات کی نشاندہی تو علماء اور مورخین کرتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی تحقیقی رائے پہلے ہی نقل کی جا چکی ہے۔ دوسرے مورخین نے بھی وضاحت کی ہے کہ دور جہانگیری لکھتے وقت اگر مغل سیاست پر حضرت مجدد کے اثرات کا ذکر نہ کیا جائے تو اس دور کی سیاست کا مطالعہ مکمل نہیں ہوگا۔

اب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی نشاندہی پر سید حیدر علی ٹونکی کے مخطوطہ "وقائع احمدی" کے حوالے سے یہ انکشاف پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ ٹیپو شہیدؒ کے حضرت شاہ ابو سعیدؒ اور حضرت شاہ ابو اللیث سے روحانی تعلقات تھے اور نہ صرف ٹیپو شہیدؒ بلکہ ان کا پورا خانوادہ شاہ ابو اللیث سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھا اس سے Wellesley Papers کے مندرجات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔

مجددیہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ ہی کی ایک شاخ ہے اور شاہ ابو سعیدؒ اور شاہ ابو اللیث

عظیم مجاہد و بزرگ سید احمد شہیدؒ کے نانا اور ماموں تھے۔ اس پورے حسنی خانوادہ پر جس کے ایک نہایت روشن بلکہ آندھیوں میں بھی جلتے رہنے والے روشن چراغ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ تھے تعلیمات مجددیہ کے اثرات کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

اسی نسبت کا اثر تھا کہ جب ۱۸۲۲ء میں سید احمد شہیدؒ حج کو جاتے ہوئے کلکتہ میں رکے تو بیگم ٹیپو شہیدؒ نے جنھیں علم تھا کہ ان کے خسر اور شوہر مولانا ابواللیثؒ سے بیعت تھے۔ ان کے خاندان سے متعلق معلومات کر کے خود بھی ان سے بیعت کی اور اپنے تمام شہزادوں اور اکلوتی بیٹی سے بھی بیعت کروائی[1]۔

یہ تمام انکشافات اور قیمتی معلومات ٹیپو شہیدؒ کی شخصیت، عقیدہ و عمل اور اصول حکمرانی پر امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے اثرات کے گواہ ہیں، اس کے باوجود یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مجدد کے جہاد و اجتہاد کا جامع تعارف کراتے ہوئے ٹیپو سلطان کے عقیدہ و عمل سے ان کا تقابل کیا جائے۔ اس تقابل کے بعد ہی یہ حقیقت پورے طور پر واضح ہوسکے گی کہ ٹیپو شہیدؒ امام ربانیؒ سے کیوں اور کس حد تک متاثر تھے اور اس تاثر کے سلطان کی شخصیت و اصول حکمرانی کے علاوہ سلطنت خداداد پر کیا اثرات مرتب ہوئے تھے؟

حضرت مجدد الف ثانیؒ ۱۵۶۳ء میں پنجاب کے ایک شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی تاجپوشی بھی پنجاب ہی کے ایک مقام کلانور ضلع گرداس پور میں ہوئی، یعنی اس دنیائے فانی میں آپ کی تشریف آوری اس ریاست میں اس وقت ہوئی، جب ہندوستان کی عنان حکومت سنبھالنے والے اس شخص کی پیدائش ہو چکی تھی جو دین اسلام کو منسوخ کر کے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا مذہب ایجاد کرنے والا تھا۔

[1] محمد الیاس ندوی، سیرت سلطان شہیدؒ، ص ۴۵، ۴۷۔

گویا تاریکیوں سے صبح کی سپیدی نمودار کرنے والے مالک و خالق نے آپ کو دنیا میں بھیجا ہی اس لئے تھا کہ آپ کے طفیل اکبر اور اس کی ہمنوائی کرنے والے گمراہ عالموں اور صوفیوں کی پھیلائی ہوئی جہل و ضلالت کی تاریکیوں کا خاتمہ ہوسکے۔

آپ کا اسم گرامی احمد کنیت ابوالبرکات، القاب، بدر الدین، امام ربانی، مجدد الف ثانی اور قیوم زماں ہے، مذہباً حنفی، نسباً فاروقی ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب، ۲۷ واسطوں سے امیر المومنین، مراد پیمبر، خلیفہ برحق حضرت عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے اور طریقت میں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں ۲۱ واسطوں سے، سلسلہ عالیہ قادریہ میں ۲۵ واسطوں سے سلسلہ عالیہ چشتیہ میں ۲۷ واسطوں سے اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ میں ۲۳ واسطوں سے پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

اکبر (۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء) نے ۵۰ برس تک پورے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۳ء سے ۱۶۲۴ء) نے اپنی ۶۳ برس کی عمر میں سے پہلے ۴۳ برس اکبری دور میں گزارے اور آخری ۲۰ برس عہد جہانگیری میں۔

عہد اکبری کو محض اکبر کے عقیدہ و عمل تک رسائی میں آسانی کے لئے تین ۳ دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پہلا دور ۱۵۵۶ء تا ۱۵۷۵ء
۲۔ دوسرا دور ۱۵۷۶ء تا ۱۵۷۸ء
۳۔ تیسرا دور ۱۵۷۹ء تا ۱۶۰۵ء

پہلے دور میں جب اکبر نوعمری میں اپنے اتالیق بیرم خاں کی سرپرستی میں تخت و تاج کا مالک بنا، ایک مخلص مسلمان تھا۔

دوسرے دور میں فتح پور سیکری میں عبادت خانے کی تعمیر، علماء میں مباحثے، ارباب عقل کے عروج اور عیسائی پادریوں کے عمل دخل سے اس کے عقیدہ و عمل میں خلل پڑنا شروع ہوا۔

تیسرا دور، دوسرے دور کا نقطۂ انجام بن کر سامنے آیا۔ کلمہ طیبہ میں محمد رسول اللہ کے بجائے "اکبر خلیفۃ اللہ" پڑھا جانے لگا۔ عربی مدارس مسمار کر دئے گئے۔ عالم و عامی بادشاہ کو سجدہ کرنے لگے اور خنزیر اور کتوں کا احترام کیا جانے لگا۔

یہ وہ دور تھا جب اسلام اور مسلمان دونوں کا وجود داؤ پر لگا ہوا تھا اور علماء و صوفیہ دونوں بجائے دین حق پر قربان ہونے کے دین حق کو اپنے مفادات پر قربان کر رہے تھے اور اکبر جس کو تاریخ میں صلح جو اور روادار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے حقیقت میں اتنا ظالم اور عدم روادار تھا کہ ذرا ذرا سی باتوں پر اپنے مخالفین کو اپنے ہاتھوں سے زہر دے کر تڑپا تڑپا کر مار دیا کرتا تھا[1]

ایسے صبر آزما دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس طرح اسلام کی سربلندی کے لئے اپنی جان، مال اور آل و اولاد کی بازی لگا کر بادشاہ وقت کے خلاف نعرۂ حق بلند کیا اور اس نعرۂ حق اور تبلیغ و ارشاد کے اکبر کے بیٹے اور دیگر شاہان مغلیہ پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ آپ بعثت نبویؐ کے الف ثانی کے لئے مجدد بنا کر بھیجے گئے تھے۔

آپ نے حکومت وقت (اکبر) کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کو دور کرنے کے لئے جہاد شروع کیا۔ کفر و اسلام کو دو الگ الگ حقیقتوں سے تعبیر کیا اور اس سلسلہ میں حکومت و معاشرہ کے با اثر لوگوں کو مکتوبات[2] تحریر کئے اور بالآخر دور جہانگیری میں آپ کی کوششیں

[1] سید معین الحق، معاشرتی اور علمی تاریخ، ص ۲۸۳ نیز عالم صدیقی۔ اختلاف کا المیہ دوم ص ۲۸۳ [2] مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب ۶۵، ۸۱، ۱۶۲۔

بار آور ہوئیں اور بادشاہ نے امور سیاست و مذہب میں مشورہ کے لئے علماء کا ایک کمیشن[1] مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

علمائے سو کے اقتدار اور ان کی شعوری کوششوں سے عوام و خواص گمراہ ہو رہے تھے، آپ نے اپنے علمی مکالمات اور مکتوبات کے ذریعہ انہیں آشنائے شریعت کیا۔[2] نظریۂ وحدۃ الوجود کی غلط تعبیر اور طریقت کی حقیقت سے بیشتر صوفیہ کی لاعلمی کے سبب اس راہ سے گمرہی کا جو سیلاب امڈ رہا تھا آپ نے اس پر روک لگائی اور نظریہ وحدۃ الشہود پیش کر کے طریقت کو شریعت کے تابع رکھنے پر اصرار کیا۔[3]

زندگی کے جن شعبوں کو امام ربانی کے جہاد و اجتہاد سے توانائی ملی ان میں

- سیاست و حکومت
- شریعت و طریقت اور
- معیشت و معاشرت

سب شامل ہیں اور ان عظیم مقاصد کی تکمیل یا حصول کے لئے آپ نے جو طویل جد و جہد فرمائی اس کو مختلف ادوار میں یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

دور اکبری ۱۵۹۱ء تا ۱۶۰۵ء

دور جہانگیری ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۴ء

اکبر کا آخری دور حکومت جو الحاد اور اسلام دشمنی کا نقطۂ عروج ہے حضرت مجدد

[1] مکتوبات امام ربانی، دفتر اول مکتوب ۵۳ بنام شیخ فرید بخاری [2] ایضاً ص ۴۳، ۴۸، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۸۰، ۸۱ [3] ایضاً ص ۸۴، ۲۹۱، دفتر دوم ۴۴۔ تذکرہ مجدد الف ثانی، ص ۱۰۴، ۱۱۰-۱۱۴۔

الف ثانی کی تبلیغی کوششوں کا نقطۂ آغاز ہے۔ دورِ جہانگیری میں آپ کی جدوجہد اور تیز ہوگئی جس کے نتیجے میں آپ کو ۱۶۱۸ء تا ۱۶۱۹ء قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔

۱۶۱۹ء تا ۱۶۲۳ء آپ جہانگیر کے لشکر میں رہے۔ یہ دور آپ پر پابندی کا دور ہے۔

۱۶۲۳ء تا ۱۶۲۴ء زبان بندی کا دور ہے۔ اسی دور میں خانقاہ سرہند میں ۶ ماہ خلوت نشین رہنے کے بعد آپ نے ۱۶۲۴ء (۲۹ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[1]

لیکن جب آپ نے انتقال کیا، اس وقت تک آپ کے جہاد و اجتہاد کے نتیجے میں فضا اتنی تبدیل ہوچکی تھی کہ مورخین کو لکھنا پڑا کہ

"جہانگیر کے دورِ حکومت میں شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانیؒ آگئے آئے۔"

آپ کی مسلسل کوششوں سے تحریک احیائے دین کا آغاز ہوا اور اس کے نتیجے میں سیاسی سطح پر جو انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوئیں وہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درباروں کی بدلتی ہوئی فضا میں دیکھی جاسکتی ہیں۔[2]

اکبر کے آخری دور میں آپ نے جس اسلامی اور تبلیغی بلکہ انقلابی مشن کا آغاز کیا تھا وہ دورِ جہانگیری میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خصوصیت سے قلعہ گوالیار میں آپ کی نظر بندی نے آپ کے انقلابی مشن کو عوام و خواص اور حکومت وقت تک نہ صرف پہنچا دیا بلکہ مستحکم بنا دیا اور بالآخر اکبر کا خانہ زاد مذہب 'دین الٰہی' اپنی موت آپ مرگیا۔

امام ربانیؒ پر بعض لوگوں نے الزامات بھی دھرے ہیں، لیکن چونکہ معاندین امام ربانی

---

[1] توزک جہانگیری، ص ۹۹۸ [2] A Short History of Indo - Pakis-tan Page 298,

میں بیشتر حکومت وقت کے نمک خوار علمائے سوء اور جاہل و غلط کار صوفیہ ہیں جن کے خلاف حضرت تا عمر جہاد کرتے رہے یا

منکرین قرآن حکیم اور دشمنان صحابہؓ جن کا مقصد زندگی ہی قرآن حکیم میں تحریف کرنا اور مکتب نبویؐ کے سنوارے ہوؤں اور بارگاہ خداوندی سے "اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے" کی سند پائے ہوؤں کو مشتبہ کرنے کی کوششوں میں خود کو روسیاہ کرنا یا

حسن خاں کابلی اور شیخ محمد صالح جیسے بدنیت اور دنیا دار لوگ جنھیں خوف تھا کہ حضرت امام کی بزرگی و حقانیت کا اعتراف کرنے سے خود ان کی حیثیت مشتبہ ہو جائے گی۔ اس لیے ان معاندین کے الزامات کی کوئی حیثیت ہے نہ حقیقت۔ ان الزامات کو اس غلاظت سے نسبت دی جاسکتی ہے جو اپنے اچھالنے والے ہی کو غلیظ اور ناپاک بنا دیتی ہے۔

بعض جعلی عبارتوں سے جو حضرت مجددؒ سے شرارتاً منسوب کر دی گئی تھیں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مغالطے میں آگئے تھے، لیکن اس کے بعد رحمت حق نے ان کی دستگیری کی اور انہوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو ایک خط لکھ کر خود ہی ان سے [illegible] حال کی وضاحت چاہی حضرت مجددؒ نے جب اصل عبارتیں ارسال کیں تو حضرت شیخؒ کی تسلی و تشفی ہوگئی اور انہوں نے اپنے فتوے سے رجوع کر لیا اور دونوں بزرگوں میں پھر پہلے ہی جیسی محبت و اخوت پیدا ہوگئی۔[1]

اکا دکا انگریزوں اور یہودیوں نے بھی مثلاً ہبریو یونیورسٹی یروشلم کے ڈاکٹر یوحنا فریڈمین نے حضرت مجددؒ پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ان نکتہ چینیوں کی کوئی حیثیت یا حقیقت اس لیے

---

[1] خلیق احمد نظامی۔ حیات شیخ عبدالحق، ص ۳۱۲، ۳۴۳-۳۴۴۔

نہیں ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے پرانی باتوں کو جن کا بے اصل ہونا ثابت ہو چکا تھا، دہرایا ہے۔ دوسرے وہ حضرت مجددؒ کی نگارشات و تخلیقات کو سمجھنے اور ترجمہ کرنے یا ترجمے کی مدد سے انہیں سمجھنے سمجھانے سے قاصر رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے اس سلسلہ میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ حضرت مجددؒ کی بیشتر نگارشات ایسی موہوب ہیں جن کا انگریزی ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اور انگریزی زبان اپنی وسعت و ہمہ گیری کے باوجود ایسے الفاظ سے خالی نظر آتی ہے جو افکار مجددیہ کی ترجمانی کرسکیں[۱]۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تصنیفات میں اثبات النبوۃ، مبدأ و معاد، مکاشفات غیبیہ، رسالہ مقصود الصالحین، رسالہ تعین ولاتعین، رسالہ در مسئلہ وحدۃ الوجود، آداب المریدین، رسالہ جذب و سلوک، رسالہ علم حدیث اور ردالرفضہ جیسے کئی نام نقل ہوتے آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شہرت میں سب سے نمایاں حصہ مکتوبات کا ہے۔

یہ مکتوبات تین جلدوں میں طبع ہو کر متعدد بار منظر عام پر آچکے ہیں۔ انہیں علم و معرفت کا مکمل خزینہ اور اسرار و معارف کا بحر بے کراں کہا جاسکتا ہے۔ جملہ مکتوبات ۳۱۳ + ۹۹ + ۱۱۴ + ۱۰ = ۵۳۶ ہیں۔

دفتر اول کو آپ کے حکم سے مولانا یار محمد جدید بخشی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا اور مرسلین عظام، اصحاب بدر اور اصحاب طالوت کی تعداد کی رعایت سے اس میں ۳۱۳ مکتوبات ہیں۔ اس کا تاریخی نام درالمعرفت تجویز ہوا تھا۔ دوسرا دفتر اسمائے حسنیٰ کی تعداد کے مطابق ۹۹ مکتوبات پر مشتمل ہے۔ اس میں سے زیادہ تر مکتوبات اس وقت لکھے گئے تھے جب آپ قلعہ گوالیار میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے زندان یوسفی اور شعب ابی طالب

[۱] ڈاکٹر اقبال، تشکیل جدید الٰہیات ص ۲۹۸-۲۹۹۔

کی سنت ادا فرمارہے تھے۔ آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ کے حکم سے آپ کے خلیفہ مولانا عبدالحئیؒ حصاری شادمانی نے یہ دفتر مرتب کیا۔ اس کا تاریخی نام "نورالخلائق" ہے۔

تیسرا دفتر آپ نے خود ہی مرتب فرمایا تھا۔ جب آپ شاہی لشکر کے ساتھ تھے۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی تعداد کی رعایت سے اس میں ۱۱۴ مکتوب ہیں۔ تاریخی نام "معرفت الخلائق" ہے۔ بطور مرتب اس پر خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کا نام درج ہے۔ اس میں دس مکتوب اضافی ہیں جن کے مضامین تو آپ کے ہیں، لیکن کتابت صاحبزادگان کی ہے۔

یہ مکتوبات آپ کے صاحب اسرار اور مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کے تو گواہ ہیں ہی انقلاب اسلامی کے بھی گواہ ہیں اور ان شخصیتوں کے مثلاً علماء، امراء، صوفیہ، قضات، سادات عظام یعنی ان لوگوں کے نام ہیں جو معاشرہ کا ضمیر ہوتے ہیں اور جن کے بننے بگڑنے پر ایک پورے معاشرے کے بننے بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور ٹیپو سلطان دونوں بزرگوں کی شخصیتوں، عہد اور تعلیمات و مجاہدات سے کما حقہٗ واقفیت ہو تو اس حقیقت کے ادراک میں دیر نہیں لگتی کہ زمانہ اور زمین کے اختلاف کے باوجود عقیدہ و عمل میں یہ دونوں بزرگ ایک ہی سمت اور راہ کے راہی تھے۔ دونوں نے انفرادی اجتماعی زندگی میں اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اصرار کیا تھا اور دونوں ہی کو اپنے زمانہ کے علماء، صوفیہ اور ارباب اقتدار سے شدید تکلیفیں پہنچی تھیں۔

سلاطین عالم کو خطوط لکھنے کی سنت پر بھی امام ربانیؒ کے بعد جس شخصیت نے عمل کی سعادت پائی وہ ٹیپو شہیدؒ کی شخصیت تھی اور چونکہ ان کی روحانی تربیت میں شاہ ابواللیث اور شاہ ابوسعیدؒ کی توجہ نے خصوصی اثر دکھایا تھا جو سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے مرشد برحق

اور برگزیدہ امام و پیر تھے، نیز ٹیپو شہیدؒ بذات خود بھی امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے ارشادات و تعلیمات سے استفادہ کرتے رہتے تھے جیسا کہ WELLESLEY PAPERS سے ظاہر ہے۔ اس لئے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی تامل یا عذر نہیں ہونا چاہئے کہ ٹیپو سلطان کے جذبہ جہاد و اجتہاد کو امام ربانی ہی کے عقیدہ و عمل نے جلا بخشی تھی۔

ٹیپو سلطانؒ نے ملکی اور ملی امور میں تمام خرابیوں کا واحد علاج "خیر القرون" کی طرف واپسی کو سمجھا۔ فتح المجاہدین، موید المجاہدین جیسی کتابوں سے جن کی تصنیف و تدوین سلطان کے حکم سے انہی کی نگرانی میں ہوتی تھی، ظاہر ہے کہ سلطان کی نگاہ میں اسلام و آزادی دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں اور مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار کو وہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کو عام کر کے اور انہیں حقیقی اسلامی تعلیمات کا مخلص پیرو بنا کر دور کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے آپ نے ہر سطح پر موثر تدابیر اختیار کی تھیں۔

راحت طلبی اور خانہ جنگی کے علاوہ جن برائیوں نے ملت کی صفوں کو سیسہ پلائی دیوار کے بجائے کرم خوردہ بنا کر رکھا تھا وہ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اسلامی رسوم کی پیروی تھی۔ ٹیپو سلطانؒ نے "جلوہ نامہ" جیسی کتابیں مرتب کروا کر عبادات و معاملات میں غیر اسلامی رسوم کی بیخ کنی کے علاوہ شادی بیاہ وغیرہ میں بھی غیر اسلامی رسوم کی بیخ کنی کرنے اور مسلم عورتوں اور گھرانوں کو ان کی تباہ کاریوں سے نجات دلانے کی کوششیں کیں۔

سلطان نے دین خالص کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوششوں میں ایک طرف تو سلطنت خداداد کے عالموں اور قلعہ داروں کو لکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکامات جاری کئے تھے لیکن بعد کے بادشاہوں اور حکمرانوں نے جن کی پابندی سے انحراف کیا تھا، انہیں دوبارہ دستخط اور مہر کے ساتھ جاری کیا جا رہا ہے تاکہ ماتحتوں کو

ان احکام کا پابند بنایا جاسکے۔

- ان لوگوں پر پابندی عائد کی جو پیری مریدی کی حقیقت نہ سمجھنے اور طریقت کے مطلوبہ معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود پیری مریدی کر رہے تھے یا اس کو پیشہ اور ذریعۂ آمدنی بنائے ہوئے تھے۔
- محرم کی رسوم مثلاً شیر، ریچھ، بندر وغیرہ کے سوانگ بھرنے پر پابندیاں عائد کیں۔
- حسب نسب پر بے جا غرور کرنے یا حسب نسب کو "برادری واد" کی سطح پر پہنچا دینے والوں کی حوصلہ شکنی کی[1]
- مسلمانوں کے مذہبی امور اور تقویٰ و عمل کی نگرانی کے لئے قاضی اور علماء مقرر کئے۔
- سجدۂ تعظیمی کو ممنوع قرار دیا۔
- تنگ دستی کے سبب شادی نہ کر سکنے والوں کی شاہی خرچ پر شادی کرانے کے ساتھ ناجائز اولاد کا باعزت گھرانوں سے رشتہ غیر قانونی قرار دیا۔
- مسلمان سپاہیوں کو نماز باجماعت کا پابند بنایا۔
- مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان میں موذن اور امام مقرر فرمانے کے ساتھ ہی مسجدوں کے ساتھ مدرسے قائم کر کے ان میں اساتذہ بھی مقرر کئے۔
- دوسری طرف وطنی اور ملکی امور میں اصلاحات کرتے ہوئے
- قابل کاشت زمینوں کو پالیگاروں اور زمینداروں کی ملکیت قرار دینے کے

---

[1] اہل نوائط خود کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و برتر سمجھتے تھے لہذا جب سلطان نے اپنے برادر نسبتی برہان الدین بن لالہ میاں کی شادی نواب بدر الزماں کی دختر سے کرنی چاہی تو اہل نوائط جو علم و فضل کے سبب قاضی اور محتسب جیسے اہم عہدوں پر فائز تھے سلطان کے خلاف ہو گئے۔

بجائے کاشتکار کی ملکیت قرار دی اور احکام جاری کئے کہ کاشتکاروں کو ان کی زمینوں سے کسی بھی صورت میں بے دخل نہ کیا جائے۔

- ان بے زمین کسانوں کو بھی زمینیں دینے کے انتظامات کئے جو زمینوں کو آباد کرنے کے خواہش مند تھے اور اس کے لئے انہوں نے درخواستیں دی تھیں۔
- افسروں اور عہدیداروں کی جاگیر کے بجائے تنخواہیں مقرر کیں اور ان کی خودمختاری پر ضرب لگائی۔
- مجلس وطنی یا پارلیمنٹ قائم کی، جس کا مقصد جمہوریت کا فروغ تھا۔ اس کا نام "زمرۂ غم نباشد" رکھا کیونکہ سلطان کا خیال تھا کہ عوام کو حکومت میں شریک کر لینے کے بعد داخلی خطرات باقی نہیں رہیں گے۔

یہ تمام اقدامات اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ سلطان جمہور دین اسلام کی حقیقی روح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خلافت راشدہ میں عملاً ظہور پذیر ہونے والی تعلیمات کے اتباع میں کس قدر مخلص اور اٹل تھے۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے جس طرح اکبر کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں اور لادینیت کا مقابلہ کیا تھا۔ اگر ایک ایک واقعہ کو سامنے رکھ کر ان کا ٹیپو شہید کے اقدامات اور اس عہد کے واقعات سے تقابل کیا جائے تو یہ حقیقت مزید واضح ہو جائے گی کہ سلطان کے عقیدہ وعمل کو جس بزرگ کی تعلیم یا قرآن وسنت کی جس تشریح نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ امام ربانی کی تعلیم وتشریح تھی۔

پروفیسر محب الحسن کا یہ بیان غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ ٹیپو سلطانؒ کا ذہنی میلان تشیع کی طرف تھا۔

"ٹیپو اگرچہ سنی مسلمان تھا لیکن تشیع کی طرف بھی اس کا کچھ رجحان تھا۔ وہ سچا مذہبی انسان تھا۔ اپنی سلطنت کا نام اس نے سلطنت خداداد رکھا تھا:

پنج وقتہ نماز پڑھتا اور رمضان کے روزے پابندی سے رکھتا تھا۔ اس کے دل میں حضرت علیؓ کی بے حد عزت وعقیدت تھی۔ اپنے اسلحوں پر اس نے اسد اللہ الغالب، کندہ کرایا تھا، جو حضرت علیؓ کا لقب تھا۔

شیعہ ائمہ سے بھی اسے عقیدت تھی، چنانچہ اپنے بہت سے سکوں کو ان کے ناموں سے اس نے موسوم کیا تھا۔ اس کے کتب خانوں کی کتابوں پر فاطمہؓ، حسنؓ حسینؓ کے ناموں کی مہریں تھیں۔ اس نے اپنے جو سفیر قسطنطنیہ بھیجے تھے انہیں ہدایت کی تھی کہ نجف اشرف اور کربلائے معلی میں حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے مقبروں پر اس کی طرف سے نذریں پیش کریں اور سلطان سے درخواست کریں کہ نجف میں چونکہ پانی کی قلت ہے اس لئے وہاں ایک نہر تعمیر کرانے کی اسے اجازت دی جائے، جس میں فرات سے پانی لایا جائے گا۔"[1]

حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، شہدائے کربلا یا جن بزرگوں کو شیعہ اپنا امام بتلاتے ہیں، ان سے عقیدت ومحبت کی بنا پر کسی شخص میں تشیع کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ عقیدہ کے فرق کے ساتھ یہ تمام بزرگ سنیوں اور شیعوں دونوں کے لائق صد احترام بزرگ ہیں اور تصوف کے سلسلوں میں ان میں سے بیشتر کو امام یا مرشد برحق تسلیم کیا گیا ہے۔ خود سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں امام جعفر صادقؒ کا نام نامی شامل ہے۔ ان بزرگوں سے عقیدت ومحبت کی بنا پر ٹیپو سلطان میں تشیع کی نشاندہی کرنا صحیح نہیں ہے۔

---

[1] محب الحسن۔ تاریخ ٹیپو سلطان، ص ۵۱۴-۵۔

سلطان شہیدؒ کو تصوف سے گہرا شغف تھا اور وہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پروفیسر محب الحسن کو سلطان کے جن معمولات پر تشیع کا شبہ ہوا ہے اس کا ازالہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی ہی ان سطور سے ہو جاتا ہے:

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت امیر (حضرت علی مرتضیٰ) اپنی جسدی پیدائش سے پہلے بھی اس مقام کے ملجا و ماویٰ تھے جیسا کہ آپ جسدی پیدائش کے بعد ہیں اور جس کو بھی فیض ہدایت اس راہ سے پہنچی وہ ان کے ذریعہ ہی پہنچی، کیونکہ وہ اس راہ کے آخری نقطہ کے نزدیک ہیں اور اس مقام کا مرکز ان سے تعلق رکھتا ہے اور جب حضرات امیر کا دور ختم ہوا تو یہ عظیم القدر منصب ترتیب وار حضرات حسنینؓ کے سپرد ہوا اور ان کے بعد اس منصب پر ائمہ اثنا عشر میں سے ہر بزرگ کا ترتیب وار تقرر ہوا۔

یہاں تک کہ نوبت حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ تک پہنچی۔۔۔"[1]

[1] مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم۔ مکتوب ۱۲۳۔

معارف کی ڈاک

مضمون فرید الدین گنج شکرؒ کے سالِ وفات کی بعض طباعتی غلطیاں

۸ جنوری ۲۰۰۲ء و ۷ فروری ۲۰۰۲ء

مکرمی ضیاء الدین اصلاحی صاحب   السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مضمون کی اشاعت کا شکریہ۔ آپ نے جس خلوص اور احتیاط سے پروف ریڈنگ کی یا کرائی وہ لائق ستائش ہے۔ تاہم ہندسوں کی کتابت میں ایک آدھ جگہ جو سہو ہو گیا ہے (اور بابا صاحب کے سالِ وصال کے بارے میں مجھے اسی قسم کے سہو کا اندیشہ ہے) اس کی نشان دہی کر رہا ہوں۔ دسمبر کے شمارے میں ان غلطیوں کی تصحیح شائع فرما دیں۔

صفحہ نمبر	جو شائع ہوا ہے	تصحیح
۴۳۹	.... اگر اس وقت صفحہ نمبر ۱۴۴....	یہاں "۱۴۳" ہونا چاہیے۔
۴۴۸	Box کی آخری لائن میں ماہنامہ منادی دہلی کے آگے "ستمبر ۱۹۶۶" لکھا ہے	یہ "۱۹۷۴ء" ہونا چاہیے۔
۴۳۲	حاشیے کے نیچے مصنف کا پتہ	کھتوال ہاؤس، ۵۴-۷۱ سٹریٹ نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ کراچی۔ ۷۵۵۳۰۔

جنوری کا معارف نظر نواز ہوا۔ میں ایک بار پھر آپ کو اس محنت اور احتیاط پر مبارک باد کہنا چاہتا ہوں جس سے آپ اس مضمون کی کتابت اور پروف ریڈنگ کرا رہے اور کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزا دے۔

تاہم چونکہ از حد احتیاط کے باوجود کتابت اور پروف پڑھنے میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی غلطی کبھی نہ کبھی ہو جاتی ہے، جس کی سب سے بڑی مثال فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے وسالِ وصال کے بارے میں کتابت اور پروف پڑھنے میں ڈھیروں غلطی کی امثال ہیں۔ معارف کے اس شمارے میں بھی مجھے اپنے پہلے اور تیزی سے پڑھے جانے والے مطالعے کے دوران ایک جگہ ایک عبارت کے چند الفاظ کا REPEFIHON نظر آیا جو یہ ہے:

صفحہ نمبر ۲۲ کی آخری سطر میں الفاظ "لعاب از دہن" دو جگہ کتابت ہوئے ہیں (جو درست ہے) تاہم یہی الفاظ صفحہ نمبر ۲۳ کی پہلی سطر میں بھی دو جگہ کتابت ہو گئے ہیں۔ چونکہ ان صفحات پر یہ فارسی زبان کے "GUOTES" کے REFEV EUES ہیں اس لئے مناسب سمجھیں تو اگلے شمارے میں یا اس شمارے میں جس میں مضمون کی آخری قسط شائع ہو تصحیح نامہ شائع کر دیں۔ یہ الفاظ صفحہ نمبر ۲۲ پر ہوں یا صفحہ نمبر ۲۳ پر۔

اب میں ایک اور امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اول بار جب میں نے یہ مضمون آپ کو بھیجا تھا تو اس میں میں نے کراچی کے قومی عجائب خانے کے قلمی نسخے کی بنیاد پر "خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو ماہِ رمضان میں خلافت نامہ ملنے کے" حوالے سے یہ عبارت نقل کی تھی:

"یک روز خواجہ طلبید، سیزدہم ماہ رمضان سنہ "و" ..."

یہ عبارت میں نے اس قلمی نسخے کی اس فوٹو کاپی سے لی تھی جو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کے پاس محفوظ ہے اور جو ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے از راہِ عنایت مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی۔ بعد میں

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی صاحب کی خصوصی مہربانی سے مجھے کراچی کے قومی عجائب خانے میں اس قلمی نسخے کی ORIGINAL دیکھنے کا موقع ملا تو انکشاف ہوا کہ فوٹو کاپی میں جو حرف "د" لگ رہا تھا (اور یہی خیال ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا تھا) وہ درحقیقت "و" نہیں تھا بلکہ دیمک کا کھایا ہوا کاغذ کا ایک شگاف تھا جو فوٹو کاپی میں "و" پڑھا جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے آپ کو ارسال کردہ ORIGINAL مضمون میں تصحیح کر کے آپ کو اس مضمون کی ایک نظر ثانی شدہ نقل بھجوائی تھی اور درخواست کی تھی کہ اس نظر ثانی شدہ مضمون کی اشاعت کو کتابت کرائیں اور پہلے سے بھیجا ہوا مضمون ریکارڈ رکھ لیں یا بابا فریدؒ کے کسی عقیدت مند کو دے دیں۔ لگتا ہے کہ میرا دوسرا خط اور نظر ثانی شدہ مضمون آپ کو نہیں ملے۔ اس خط کے ذریعے آپ سے گزارش ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ تصحیح بھی مضمون کی آخری قسط کے ساتھ شائع کر دیں۔ اس مقصد کے لئے ایک تقابلی گوشوارہ پیش خدمت ہے۔

(۱) صفحہ نمبر ۲۳ میں "کراچی کے قومی عجائب خانہ کے قلمی نسخہ کے کالم میں" ماہ رمضان میں خلافت نامہ ملنے کے بارے میں قائم کئے ہوئے عنوان کے آگے لفظ "سنہ" اور الفاظ "ستین وستمائۃ" کے درمیان حرف "و" کو حذف سمجھا جائے۔

(۲) صفحہ نمبر ۲۵ میں نمبر شمار "۳" کے آگے جو اس صفحے کے تقریباً وسط میں ہے، مضمون اب یوں ہوگا۔

"تیسرے اقتباس میں جو ماہِ رمضان سے متعلق ہے، قومی عجائب خانہ کراچی کے قلمی نسخے میں "سنہ ستین وستمائۃ" لکھا ہے جس کا ترجمہ ۶۶۰ھ ہوگا..... سیاق و سباق سے یہاں پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومی عجائب خانے کے قلمی نسخے میں گنتی کے ایک عربی لفظ کی کتابت لفظ "سنہ" اور الفاظ "ستین وستمائۃ" کے درمیان ہونے سے رہ گئی۔"

کراچی میں غریب خانے کا نام "کھتوال ہاؤس" ہے "کھٹوال ہاؤس" نہیں جو انگریزی حروف تہجی کی مجبوری ہے۔ امید ہے ایک ماہ قبل میں نے جو خط بھیجا تھا وہ مل گیا ہوگا۔

دعا گو اور دعا جو

فروز الدین احمد فریدی

مطبوعات جدیدہ

معارف الحدیث (ہشتم) : از جناب مولانا محمد منظور نعمانیؒ، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت وطباعت، مجلد صفحات ۶۹۲، قیمت ۲۰۰/روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد، لکھنؤ۔

مولانا منظور نعمانی نے عقیدہ وکلام اور فقہ وتصوف کے موضوعات پر کثرت سے تحریریں سپرد قلم کیں، لیکن علم حدیث میں ان کی معارف الحدیث کو خاص مقام حاصل ہے، اس سلسلے کی سات جلدوں میں انہوں نے کتاب الایمان سے کتاب المعاشرہ تک مستند احادیث کے انتخاب، تشریح اور توضیح کی نہایت مفید علمی ودینی خدمت انجام دی، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی آٹھویں اور آخری جلد ہے، جو ان کے انتقال کے چار سال بعد شایع ہوئی ہے۔ اس میں کتاب العلم، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ، کتاب الفتن اور کتاب الفضائل کی احادیث شامل ہیں، مباحث کو سہل وسادہ اور منطقی اسلوب میں پیش کرنے کا مولانا کو خاص ملکہ تھا، اس مجموعہ کی بھی سب سے نمایاں خوبی یہی ہے، خاص طور سے نبی کریم ﷺ کے مرض وفات، نزول حضرت عیسیٰؑ، ظہور مہدی، فضائل خلفائے راشدینؓ اور کتاب الفتن کی احادیث شریفہ میں ان کا انداز بیان بڑا موثر ہے، اہل قرآن، منکرین سنت اور اہل تشیع کے رد میں ان کی طبعی مناظرانہ صلاحیت بھی جابجا نظر آتی ہے، لیکن اصل روح یعنی حضور اکرم ﷺ سے ایمانی تعلق اور حصول ہدایت پوری کتاب میں جاری وساری ہے، مولانا مرحوم کی علالت اور پھر انتقال کی وجہ سے چند ابواب تشنہ رہ گئے تھے، ان کی تکمیل ان کے خویش مولانا محمد زکریا سنبھلی نے بخوبی کردی، مولانا مرحوم کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمن نے مقدمہ میں اس خوبی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تشریح و

تفہیم بنیادی طور پر فکر ولی اللہی کی روشنی میں کی گئی ہے، کتاب مولانا کی طویل دینی وعلمی زندگی کے خاتمہ بالخیر کی دلیل ہے، کتابت وطباعت عمدہ ہے، لیکن کنز العمال کو کنزل العمال کئی جگہ لکھا گیا ہے۔

پاکستان کے نعت گو شعراء : از جناب سید محمد قاسم، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت وطباعت بہتر، مجلد صفحات ۳۶۸، قیمت ۲۰۰/روپے، پتہ: ہارون اکیڈمی، ۸/۲۹۴ محمد مصطفی کالونی، بلاک ایم سکٹر ۱۱، ۱/۲، اورنگی، کراچی۔

اردو شاعری میں نعت گوئی کی روایت روز اول سے قائم ہے لیکن دور حاضر میں اس صنف سخن پر زیادہ توجہ کی گئی ہے، خصوصاً پاکستان میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہے، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہاں گذشتہ بیس پچیس سالوں میں جتنے نعتیہ مجموعے شایع ہوئے وہ اردو شاعری کے چار سو سال کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہیں، اس کتاب کے لائق مؤلف نے شاید اسی دعویٰ کے اثبات کے لئے یہ تذکرہ مرتب کردیا اور پہلی جلد میں سو کے قریب صاحب مجموعہ نعت گو شعراء کا انتخاب اس سلیقے اور جامعیت سے پیش کردیا کہ ایک صفحہ میں شاعر کا تعارف اور دو صفحوں میں نمونہ کلام آگیا، اشعار کے انتخاب میں یہ احتیاط بھی قابل ستایش ہے کہ اظہار عقیدت، حد شرعی سے متجاوز نہ ہو، حروف تہجی کے اعتبار سے اس مجموعہ میں اثر صہبائی سے بیر اسعدی تک کا ذکر ہے، توقع ہے کہ دوسری جلد میں یہ سلسلہ مکمل ہوجائے گا، ایک جگہ سہو کتابت سے کھنڈوہ، کھنڈرہ ہوگیا ہے۔

قطب الہند سیدنا عبدالوہاب جیلانی” : از جناب غلام یحییٰ انجم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات، ۲۳۴، قیمت ۷۰/روپے پتہ: کتب خانہ امجدیہ، نزد ٹاؤن کلب، پکا بازار، بستی۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے صاحبزادے سیف الدین عبدالوہابؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ تبلیغ ودعوت کے لئے ہندوستان تشریف لائے اور یہیں ناگور میں

آسودۂ خاک ہوئے، ہندوستان میں سلسلہ قادریہ کا فروغ بھی اصلاً ان کی ذات بابرکات سے ہوا، لیکن بعض مؤرخین و محققین کا خیال اس کے برعکس ہے، زیر نظر کتاب میں اسی بحث کو موضوع تحقیق بنا کر ثابت کیا گیا ہے کہ اول الذکر خیال ہی صحیح ہے، فاضل محقق نے حکومت کے ایک تحقیقی پروجیکٹ کے تحت شمالی ہند میں سلسلۂ قادریہ کے آغاز و ارتقاء کو موضوع بنایا تھا، یہ کتاب اسی منصوبہ کا ایک حصہ ہے، جس میں ہندوستان میں بانی سلسلہ شیخ عبدالوہابؒ ان کی اولاد و اخلاف کے متعلق معلومات ہیں، دستاویزات و فرامین، تصاویر اور کتابیات کا التزام بھی کیا گیا ہے، محنت و جستجو کے باوجود بعض مقامات واضح نہیں ہو پائے، شیخ عبدالوہابؒ کا ایک عرفی نام عبدالرزاق بھی بتایا جاتا ہے، مصنف نے اس رائے کو "ہر اعتبار سے محل نظر" قرار دیا ہے، لیکن "ہر اعتبار" کی تفصیل نہیں کی، بلکہ چند سطروں کے بعد اس کے درست ہونے کے امکان کو بھی تسلیم کرلیا ہے، ایک جگہ وہ اس "عقدہ کو سمجھ سے بالاتر" سمجھتے ہیں کہ باوجود مرتبت علمی و کمالات دینی کے شیخ عبدالوہاب کے حالات قدیم کتابوں میں تفصیل سے کیوں نہیں ملتے، اس کے لئے انہوں نے "قدیم مؤلفین کو ریسرچ و تحقیق کے دشوار گذار مراحل سے کنارہ کشی اختیار" کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے، قدرتاً کتاب میں کرامتوں کی تفصیل ہے، لیکن شروع کی بحث زیادہ دلچسپ ہے، جس میں "تصوف کو ایک قسم کی سائنس سے تعبیر کیا گیا ہے جو موجودہ ظاہری سائنس سے کئی درجہ فائق و برتر ہے،" یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلینؑ اسرار تصوف سے واقف تھے، لیکن باضابطہ صوفی کے لقب سے ابوہاشم کو نوازا گیا، یہ عموم بھی دلچسپ ہے کہ "جب ہر ایک نے خود کو عابد و زاہد کہنا شروع کیا تو نفاق سے بچنے والوں اور واقعی اللہ والوں نے اپنے لئے صوفی کا لفظ خاص کرلیا،" ناگور میں شیخ عبدالوہاب کے مزار کی بحث اثبات و نفی میں فاضل محقق کا رجحان اثبات کی جانب ہے، اس سلسلہ میں ناگور کے ایک دوسرے خانقاہی نظام سے چشمک و نزاع کا ذکر افسوس ناک ہے، ابوالفضل و فیضی اور صوفی حمید الدین ناگوری کی اولاد کے متعلق حاسدین و مفسدین کے الفاظ بھی ملتے ہیں، مصنف مشاق اہل قلم ہیں، لیکن مشائخین، بھاری

اکثریت، کسی دوسرے القابُ خلافت و جانشینی کا کیا معنیٰ، دونوں دو واقعہ ہے، وضو بنائیں، باعث عجب، جیسے الفاظ و تعبیرات بھی آ گئے ہیں، کہیں کہیں ترجمہ بھی محل نظر ہے (صفحہ ۵۴، ۷۱، ۷۲) البتہ دستاویز و فرامین کے اصول میں جو محنت کی گئی ہے وہ قابل قدر ہے، سلسلہ قادریہ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب خاص طور پر مفید اور پراز معلومات ہے۔

جگن ناتھ آزاد بطور اقبال شناس: از محترمہ یاسمین کوثر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۶، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر ۲۱۲۔ راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

مشہور شاعر و نقاد اور ماہر اقبالیات جناب جگن ناتھ آزاد کے سوانح و خدمات پر کئی کتابیں موصول ہوئی ہیں، جن میں بجا طور پر ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ قدر شناسی کے جذبے سے لیا گیا ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے میں شامل ہے، یہ اگرچہ لاہور کے اورینٹل کالج کی ایک لائق طالبہ کے ایم اے فائنل کا مقالہ ہے، لیکن اس میں جناب آزاد کی شخصیت اور علامہ سے ان کی وابستگی و شیفتگی اور ان کی اقبالی کتابوں اور تحریروں کا ایسا جامع مطالعہ کیا گیا ہے کہ نفس موضوع کا شاید ہی کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو، یہ محنت و سلیقہ لائق تحسین ہے۔

کتاب البلاغۃ شرح دروس البلاغۃ: از جناب رشید احمد، مولانا موسیٰ آدم سیلوڈوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۳، قیمت ۱۳۰ روپے، پتہ: زکریا بک ڈپو دیوبند۔ یوپی۔

عربی مدارس میں فن بلاغت کی تعلیم کے لئے کتاب مختصر المعانی عام طور سے شامل نصاب ہے، لیکن اس منتہی کتاب سے پہلے اصطلاحات اور اصول و قواعد کی بآسانی تفہیم کے لئے ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی اس کے لئے دروس البلاغۃ کو ترجیح دی گئی جس کو خاص طور پر اسی مقصد کے لئے بعض مصری ماہرین تعلیم نے مرتب کیا تھا، زیر نظر کتاب اسی کی اردو شرح ہے، ترجمہ و تشریح میں سلاست ہے، طلبہ کو اس سے یقیناً فائدہ ہوگا۔

ازواج مطہراتؓ : از جناب شکیل الرحمٰن نظامی مصباحی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ نظامیہ حبیبیہ، نظامی مارکیٹ لہرولی بازار، کبیر نگر یوپی۔

امہات المومنینؓ کی مبارک زندگی اور ان کے حالات کا یہ پاکیزہ تذکرہ نوآموز مؤلف کی پہلی تحریری کاوش ہے، لیکن مطالعہ و تحقیق اور تحریر کی سلاست و سادگی میں پختگی بھی ہے اور اثر بھی، رسالہ اور صاحب رسالہ قبولیت اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

دستک : از جناب قمر رسول پوری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یہ تازہ اور خوب صورت مجموعہ کلام ایک نسبتاً کم نام شاعر کے پاکیزہ جذبات و احساسات کا ترجمان ہے، جناب قمر رسول پوری کی شخصیت سادگی اور شرافت سے عبارت ہے، ان کی شاعری میں بھی یہی عناصر نمایاں ہیں، حمد و نعت اور غزلوں کے علاوہ نظموں اور قطعات پر مشتمل یہ مجموعہ بامقصد اور صالح ادب میں اچھا اضافہ ہے، شروع میں کئی تاثراتی تحریریں بھی ہیں جن میں ان کی بامقصد، بلند اور توانا شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔

جنرل انگلش فار جونیرس : از جناب ایس، عبداللہ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۷۲، قیمت ۴۵ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس نزد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ۔

زیر نظر کتاب سے پہلے لائق مؤلف کی ایک اور کتاب جنرل انگلش فار یو شایع ہوچکی ہے، کتاب مقبول ہوئی، اب اس کتاب میں بھی انگریزی گرامر اور کمپوزیشن کو بڑے آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے، مؤلف نے انگریزی تعلیم و تدریس کے اپنے تجربات کی مدد سے اس کتاب کو خوب تر اور مفید تر بنا دیا ہے، تمہید یا مقدمہ نہیں ہے جس کی وجہ سے دونوں کتابوں کی درجہ بندی نہیں ہو پاتی ہے۔

ع۔ص۔